بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

درس قرآن

یعنی تفسیر

استعاذہ، بسم اللہ و سورۃ الفاتحہ

اثر خامہ

خطیب العلماء مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ

ناشر

مکتبہ غزالی

متصل مسجد فرقانیہ جیکب لائن کراچی ۳

ہدیہ رف کاغذ۔ دو روپے۔ سفید گلیز تین روپے

ب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

حرفِ اوّلین :-

خطیب العلماء مفسر قرآن حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی دامت برکاتہم کا درس قرآن مجید ایک عرصہ دراز تک ریڈیو پاکستان سے صبح کے وقت نشر ہوتا رہا ہے اور اب تقریباً ڈھائی سال سے پاکستان کے مشہور ترین اور کثیر الاشاعت اخبار "جنگ" کے جمعہ ایڈیشن میں تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ملک اور بیرون ملک کے خواص اہل علم اور ذی فہم عوام نے ان دونوں سلسلوں کو بے حد پسند کیا اور اپنے دلی تاثرات مدح و ستائش سے بھرپور خطوط میں لکھے اور برابر لکھتے رہتے ہیں

عوام اور خواص کا ایک عرصہ سے یہ مطالبہ چلا آرہا تھا کہ مولانا کا درس قرآن کریم کتابی شکل میں شائع ہو جائے۔ الحمد للہ کہ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر مکمل ہوگئی طرز بیان انتہائی سلیس، شگفتہ اور شیریں ہے۔ تحقیقی مسائل کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آیات قرآنی کا مفہوم عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد ایسی خصوصیات ہیں جن کا اندازہ مطالعہ سے ہوگا۔

مکتبہ غزالی اس سے قبل مولانائے موصوف کی دو کتابیں "رمضان المبارک" اور "کلمۃ الحق" شائع کر چکا ہے۔ لہذا اس تفسیر کی اشاعت کو اس نے اپنا اولین فریضہ سمجھ کر اس کیلئے سعی کی۔ کتابت و طباعت اور کاغذ کے معاملہ میں اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ کوئی کوتاہی باقی نہ رہے۔ مکتبہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا ہے اس کا فیصلہ آپ ہی کرسکیں گے۔

شاھد میاں

ناظم مکتبہ غزالی جیکب لائن کراچی ۳

فہرست کتب ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیں۔

سورۃ الفاتحۃ مکیۃ — آیاتہا ۷ — رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہے ہر ہر عالم کا جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ

جزا کے دن کا مالک ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور

نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ بتلا دیجئے ہم کو سیدھا راستہ۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ

راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام کیا ہے۔ جن پر نہ

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

غضب کیا گیا ہے اور نہ وہ گمراہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

القرآن
اور
اس کا موضوع

از مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ

"القرآن" اس کلامِ خداوندی اور آسمانی کتاب کا نام ہے جو خاتم المصاحف اور جامع الکتب کی حیثیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے نازل ہوئی جس پر دینِ اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کی اساس اور بنیاد ہے۔ مشہور آسمانی صحیفوں میں یہ چوتھی اور نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح مکمل ترین اور آخری کتاب ہے اور غایت فضیلت اور نہایت عظمت کی بنا پر جس طرح ذاتِ خداوندی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نام ہیں اسی طرح اس کتاب کے بھی مختلف اور متعدد نام ہیں جن میں سے زیادہ مشہور نام "القرآن" ہے۔

علماء لغت نے اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح کفران اور رجحان عربی لغت کے دو لفظ ہیں۔ اسی نوعیت کا لفظ "قرآن" بھی ہے۔ جو قراۃ سے بنا ہے اور اس کے معنی پڑھنے یا تلاوت کرنے کے ہیں۔ اور کتاب اللہ چونکہ ابتداء ہی سے پڑھی گئی اور تلاوت کی گئی ہے اس لئے اس کو "القرآن" کہا گیا ہے۔ مگر بعض دوسرے محققین

کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ کسی سے بنا ہوا نہیں ہے بلکہ جس طرح حق تعالیٰ کے ناموں میں سے لفظ "اللہ" ذاتی نام ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمار گرامی میں سے لفظ محمد و احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ذاتی اسمار ہیں۔ اسی طرح کتاب اللہ کے ناموں سے "القرآن" اس کا ذاتی نام ہے اور اس کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ قرآن وہ آسمانی کتاب ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بطور وحی آسمانی کے نازل ہوئی اور اس کے سوا باقی تمام نام قرآن کے صفاتی نام ہیں جیسے "الکتاب، الذکر، ہدیٰ، الفرقان" وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال کتاب اللہ کے اسمار گرامی میں سے مشہور نام "القرآن" ہے جس کی تفسیر و تشریح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ قرآن کریم کی کسی سورت یا کسی آیت کی تشریح پیش کی جائے یہ ضروری ہے کہ ہم قرآن کا موضوع اور اس کا مقصود اعظم معلوم کریں کہ یہ کتاب کس مضمون کی کتاب ہے۔ اس کا موضوع اور مقصود کیا ہے تاکہ ایک طرف کلام ربّانی کے صحیح منشاء کو سمجھ سکیں اور دوسری طرف غیر ضروری اور لایعنی امور کو خدا کے کلام میں نہ تلاش کریں اور نہ زبردستی اس میں داخل کرنے کی کوشش کریں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں گذشتہ قوموں کے واقعات و حالات انبیاء سابقین کے کارنامے یا نبیوں کے ساتھ قوموں کا سلوک وغیرہ امور جو ہزارہا برس کی تاریخ سے متعلق ہیں قرآن کریم میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود قرآن کا موضوع تاریخ نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخ افراد و اقوام کے حالات کو اول سے آخر تک تسلسل کے ساتھ ذکر کرتی ہے یا عہد بعہد زمانہ اور وقت کی ترتیب اس میں ملحوظ ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم کا یہ طرز اور طریقہ نہیں ہے کہ کسی ایک واقعہ کو تسلسل کے ساتھ بیان کرے۔ بلکہ واقعات کے مخصوص اجزاء ترتیب اور زمانہ کا لحاظ کئے بغیر مختلف پاروں اور مختلف سورتوں میں موقع کی

مناسبت سے ذکر کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کا مقصد حالات اور واقعات کا بیان نہیں ہے بلکہ عہدِ ماضی کے جس واقعہ سے یا واقعہ کے کسی جز سے جو سبق اور عبرت وابستہ ہے قرآن کریم صرف اسی کے ذکر پر اکتفا، کرتا ہے یہاں تک کہ تاریخی اعتبار سے جو واقعات بعد کے ہیں، وہ ابتداء میں مذکور ہیں۔ اور جو اجزاء واقعہ کے ابتدائی حصے سے متعلق ہیں وہ بعد میں ذکر کئے گئے ہیں اور قرآن کریم نے اپنے اس انداز کی وضاحت بھی ان الفاظ میں فرمادی کہ "لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ یعنی عہدِ ماضی کی حکایتوں میں بڑے بڑے سبق اور بڑی عبرتیں پوشیدہ ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم تاریخی اجزاء کو عبرت اور سبق آموزی کے لئے نقل کرتا ہے اور موضوع اس کا تاریخی نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی پیدائش یا تخلیق انسانی کے تدریجی دور یا جسم انسانی کے اعضاء کا تذکرہ قرآن کریم کی مختلف آیات میں ملتا ہے۔ مگر اسکے باوجود قرآن کا موضوع تشریح الابدان یعنی اعضاء بدن کی خلقی تشریح نہیں ہے۔ بلکہ جسمِ انسانی کے بعض اجزاء کا تذکرہ عرف اور محاورہ کے مفہوم میں بیان کیا گیا ہے جس کا تشریح الابدان سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے قرآن کریم میں ایک آیت ہے "مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ" یعنی کسی انسان کے سینہ میں اللہ نے دو دل نہیں بنائے۔ پس آج اگر تجربہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ کسی کے سینہ میں دل کے دو یا تین لوتھڑے بنے ہوئے ہیں تو قرآن کریم کی اس آیت کی صداقت پر کوئی آنچ نہیں آسکتی، کیونکہ قرآن کا موضوع جسم انسانی کی تشریح یا اس کی تخلیق کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس جملہ کا مفہوم عرف اور محاورہ کے مطابق یہ ہے کہ انسان میں یک وقت میں ایک ہی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ دو متضاد کیفیتیں پیدا نہیں ہو سکتیں کسی اردو کے شاعر نے اس مفہوم کو بعینہ انہی الفاظ میں ظاہر کیا ہے

ع پہلو میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔

غرضیکہ قرآن کریم میں مختلف علوم و فنون اور مختلف مباحثے ملتے ہیں لیکن قرآن کا اپنا موضوع صرف ایک ہے اور وہ فرد و قوم کی روحانی اور اخلاقی اصلاح یعنی ایک فرد میں روحانی اعتبار سے جتنی چھوٹی بڑی برائیاں یا بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کی اصلاح کس طرح کی جائے اور ان کی جگہ فضائل اور اخلاق حمیدہ کس طرح پیدا کیے جائیں، فرد کا فرد کے ساتھ یا مخلوق کا خالق کے ساتھ کیا سلوک اور برتاؤ ہونا چاہیے، یا ملتوں اور قوموں میں عروج و زوال کس طرح رونما ہوتا ہے یا ان میں موت و حیات کن اسباب اور راستوں سے آتی ہے۔ ان سب چیزوں کی مکمل ہدایات کا مجموعہ قرآن کریم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ملتوں اور قوموں کے لئے قرآن کریم کی حیثیت بوعلی سینا کے قانونِ شفا کی طرح پر ہے جس میں کوئی چھوٹا بڑا مرض ایسا نہیں ہے جس کا نشان دوا، علاج اور پرہیز موجود نہ ہو۔ بس انسانوں کے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن ایک ناقابل تردد روحانی قانونِ شفا ہے جس میں بیماری و صحت کے تمام تفصیلی نسخے موجود ہیں اور اپنی اسی حیثیت کا تذکرہ قرآن نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ"

ترجمہ۔ اور ہم قرآن اتارتے ہیں جو اہلِ ایمان کیلئے شفا اور رحمت ہے، دوسری جگہ قرآن کریم نے اپنے بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کیا ہے کہ انسانوں کی سب سے بڑی بیماری کا نام گمراہی ہے، اور گمراہی کو دور کرنے کیلئے اور اقوام عالم کی ہدایت کیلئے اللہ نے قرآن کریم کو نازل فرمایا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ — بلاشبہ یہ قرآن ہدایت کرتا ہے ایسے راستہ کی جو بالکل سیدھا ہے

ترجمہ: یقیناً یہ قرآن وہ راہ بتاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے
علامہ اقبال مرحوم نے قرآن کریم کی سب سے بڑی تعریف اسی نہج اور اسی طرز پر کی ہے ؂

آں کلام زندہ قرآنِ حکیم   حکمتِ او لایزال است و قدیم
حرف او را ریب نے تبدیل نے   معنیش شرمندۂ تاویل نے
نسخۂ تکوین اسرار حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

یعنی اللہ کے اس کلام میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب اور قوموں کی عزت و سربلندی کے اسرار بیان کئے گئے ہیں۔ اور اسی قرآن کی بدولت جو قومیں گھٹنوں چلنا نہیں جانتی تھیں وہ دنیا میں رستم اور شہسوار بن گئیں۔

پس قرآن کریم جس کا موضوع فرد اور قوم کی اصلاح ہے، اپنے موضوع کے اعتبار سے اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر سب سے زیادہ کامیاب کتاب ہے جس سے تیئیس سال کی مدت میں دنیا کی عیب دار اور بگڑی ہوئی قوم زندگی کے ہر شعبہ میں کامل اور مکمل انسان بلکہ انسانوں کی ہادی اور رہبر بن گئی اور بکریاں چرانے والے صاحب تخت و تاج ہو گئے۔ اور اس پس ماندہ قوم کو تدبیر منزل سے لگا کر سیاست داں اور اقوام عالم کا امام بنا دیا۔ قرآن کریم کی اس تاثیر اور اس کے فیوض و برکات کا نقشہ اکبر الہ آبادی مرحوم نے ایک قطعہ میں اس طرح کھینچا ہے ؂

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا۔
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا۔
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

درسِ قرآن

یعنی

تفسیر استعاذہ، بسم اللہ و سورۃ الفاتحہ

(افادات)

مجاہد فی سبیل اللہ

خطیب العلماء مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ

ناشر

مکتبہ غزالی متصل مسجد فرقانیہ جیکب لائن کراچی

ھدیہ۔ رف کاغذ (ـ/۳) تین روپے۔ (گلیز چار روپے پچاس پیسے) ۵۰/۴

۷۸۴

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

الاستعاذہ

قرآن کریم لفظاً اور معنیً خدا کا کلام ہونے کی وجہ سے مقدس اور قابلِ تعظیم ہے جس کی تلاوت کے لئے، چھونے اور ہاتھ لگانے کیلئے حتیٰ کہ کتابت اور اشاعت کے لئے اس کے شایان شان اور آداب بھی ہیں اور تکریم و آداب کے یہ تمام طریقے بھی انسان اپنی ناقص فکر سے تجویز نہیں کر سکتا تھا اس لئے یہ بھی اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے یہ تمام آداب اور طریقے قرآن کریم میں بیان فرما دیئے۔ مثال کے طور پر ہاتھ لگانے اور چھونے کے لئے خود قرآن کریم نے قرآن کا یہ ادب بتلایا کہ:-

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ‎ یعنی ہر قسم کی طہارت و پاکی کے بغیر قرآن کریم کو چھونا اور ہاتھ لگانا جائز اور روا نہیں ہے۔

یا اسی طرح احکم الحاکمین کے شاہانہ کلام کے لئے احترام کا یہ طریقہ بتلایا کہ جب وہ پڑھا جائے تو سننے والوں پر نہ صرف یہ کہ ہیبت و عظمت کی خاموشی طاری ہو جائے۔ بلکہ دل کے تمام گوشے اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اسی طرح تلاوت کے آداب میں سے ایک ادب قرآن کریم نے استعاذہ کا بھی تبلایا۔ یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھنا۔

"استعاذہ" لغوی تحقیق کے اعتبار سے عوذ سے بنا ہے۔

جس کے معنی ہیں پناہ لینا۔ اور استعاذہ کے معنی ہیں پناہ چاہنا یا پناہ مانگنا، اور قرآن کریم کی اصطلاح میں استعاذہ کے معنی ہیں اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیم" پڑھنا۔ کلامِ خداوندی کی جب تلاوت کی جاتی ہے تو اس کی ابتدا اور آغاز پہلے "اعوذ باللہ" سے اور بعد میں بسم اللہ سے کی جاتی ہے اور یہ طریقہ بھی خود قرآن کریم ہی نے ہمیں بتلایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" (سورۂ نحل آیت ۹۸)

یعنی جب آپ قرآن کریم کے پڑھنے کا ارادہ کریں تو اللہ کے ذریعہ مردود شیطان سے پناہ مانگیں۔

اسی لئے اس آیت کے تجویز کئے ہوئے الفاظ اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیم تلاوت قرآن کے آداب کے طور پر آغاز میں تلاوت کئے جاتے ہیں اور تلاوت سے پہلے الفاظ استعاذہ کی تجویز میں چند در چند اور بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں سے ایک واضح اور نمایاں مصلحت یہ ہے کہ جب کبھی کوئی شخص کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی تو شیطان اس نیکی سے باز رکھنے کے لئے طرح طرح کے وساوس اور برے خیالات انسان کے دل میں ڈالتا ہے جس کی تصریح خود قرآن کریم نے اس طرح فرمائی

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ

یعنی شیطان وہ ہے جو انسانوں کے دلوں میں برے خیالات اور وسوسے ڈالتا ہے۔

پھر جو نیکی اپنی اہمیت و عظمت کے لحاظ سے جتنی زیادہ موجبِ قرب ہوتی ہے اتنا ہی شیطان وسوسوں کے ذریعہ سدِ راہ بن جاتا ہے

اور شریعتِ اسلامیہ میں یہ امر مسلّم ہے کہ تلاوتِ قرآن سے جتنا اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اتنا کسی عبادت سے نہیں ہوتا۔ جس پر علماء نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب بھی نقل فرمایا ہے کہ انھوں نے خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا اور حق تعالے سے سوال کیا کہ یَارَبِّ دُلَّنِیْ اِلٰی اَقْرَبِ الطَّرِیْقِ اِلَیْکَ۔ یعنی اے میرے پروردگار مجھے اپنے تک پہنچنے کا سب سے قریب ترین راستہ بتلایئے۔ حق تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "تِلَاوَتُ الْقُرْاٰنِ"[1] اور مولانا جلال الدین رومیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن اور اس کے الفاظ یہ حق تعالے کی ملاقات اور اس کی زیارت کا سامان ہیں۔ کیونکہ ہر کلام متکلم کا آئینہ دار ہے جس میں متکلم کے خدوخال اور اس کے حُسن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

پس سب سے زیادہ قربِ خداوندی حاصل کرنے والی عبادت تلاوتِ قرآن کے ارادے پر شیطانی وساوس اور اس کی رکاوٹیں کسی قدر سدِّراہ ہونی چاہئیں۔ لہٰذا تلاوتِ قرآن کے علاوہ بھی ہم کسی نیکی کا ارادہ کریں تو شیطان کے وسوسوں سے بچنے کے لئے بھی ہم کو استعاذہ کے یہی الفاظ پڑھنے چاہئیں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے ہم کو اسی قسم کی ہدایت کی ہے:۔

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ — یعنی جب شیطان تمہارے دِل میں وسوسہ ڈالے تو فوراً استعاذہ کے الفاظ پڑھو

اسی لئے قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے ان الفاظ کا تجویز کرنا تلاوتِ قرآن کی عبادت اور اس کی اہمیت کے عین مطابق ہے۔ پس اس طرح تلاوت کرنے والا سب سے پہلے حق تعالیٰ سے راستہ کی

[1] قرآن کی تلاوت

رکاوٹوں کو دور کرنے کی درخواست کرنا ہے اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے فضل اور اپنی رحمت کے دامن میں مجھے پناہ نہ دی تو میں تلاوتِ قرآن جیسی اہم عبادت کی انجام دہی سے عاجز اور محروم رہوں گا

اور الفاظ استعاذہ کی تجویز میں ایک حکیمانہ پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کا کلام جو درحقیقت اس کی صفت ہے اپنی عظمت اور برتری کے لحاظ سے ہمارا منہ اور زبان اس قابل نہیں ہیں کہ ہم اس کا تلفظ کر سکیں تاوقتیکہ اپنی زبان و ذہن کو پورے طریقہ پر پاک نہ کریں۔ گویا کہ استعاذہ کے الفاظ ایک قسم کا روحانی آبِ زلال ہے جس سے ہم سب سے پہلے اپنی زبانوں اور اپنے منہ کو پاک کر لیتے ہیں اور پھر خدا کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں۔ کسی عارف نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

البسملہ

عربی لغت کے امام اور محققین نے عربی میں بعض ایسے مخصوص الفاظ وضع کئے ہیں جو کسی عبارت اور جملہ کا خلاصہ یا مخفف ہیں اور ان مفرد الفاظ سے پورے جملے اور عبارت کی طرف اشارہ ہوتا ہے جیسے حوقلہ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھنا۔ حمدلہ۔ الحمدللہ رب العلمین کہنا۔ طبقلہ "اطال اللہ بقارک" کہنا وغیرہ۔ جملوں اور عبارتوں کے ان مخفف الفاظ میں سے ایک لفظ "بسملہ" بھی ہے۔ جس سے مراد ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔ جو اس مضمون کا موضوع ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" قرآن کریم کی آیتوں میں سے دو الگ الگ آیتیں ہیں۔ ایک سورۂ نمل میں جہاں حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس خط کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ملکۂ سبا کو لکھا گیا تھا اور ملکۂ سبا نے غایت احترام کی وجہ سے اس کو "کتاب کریم" کا لقب دیا۔"

اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — وہ سلیمان کی طرف سے ہے، اور اس میں یہ مضمون ہے (اوّل) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم کی دوسری آیت بسملہ وہ ہے جو تلاوت قرآن کے لئے "استعاذہ" کے بعد پڑھی جاتی ہے اور ہر سورۃ کے شروع میں لکھی ہوئی ہے۔ سورۂ نمل کی آیت بسم اللہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اتری اور آغاز سورۃ والی بسم اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ بسملہ سلیمانی سورہ نمل کا جزو اور اس کی مستقل آیت ہے۔ اور بسملہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کسی سورۃ کا جزو اور کسی سورۃ کی مستقل آیت نہیں ہے بلکہ قرآن کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے جو داخل قرآن ہے۔ مگر داخلِ سورۃ نہیں۔ بسم اللہ کا مقصد نزول تلاوت قرآن کا ادب اور سورتوں کے مابین حدِّ فاصل اور امتیاز قائم کرنا ہے۔

صحابۂ کرام سے مروی ہے کہ قرآن کی نازل ہونے والی سورتوں کے ختم اور آغاز کا ہمیں اس وقت تک پتہ نہیں چلتا تھا جب تک کہ آیت بسم اللہ نازل نہ ہوتی تھی۔ اسی بنا پر سورہ نمل والی بسم اللہ سورۃ کی باقی آیتوں کے ساتھ ملا کر لکھی جاتی ہے۔ اور آغاز سورۃ والی بسم اللہ سورۃ کی تمام آیتوں سے الگ بلکہ لکیروں سے بنائے ہوئے چوکھٹے میں علیحدہ لکھی جاتی ہے اور یہ قرآن کی حفاظت کی خاطر رسم الخط اور کتابت کے وہ دقیق نکتے ہیں جن میں قیامت تک کسی قسم کا رد و بدل کرنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔

حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے اَلْبَسْمَلَۃُ تِیْجَانُ السُّوَرِ[1] یعنی قرآن کریم کی ہر سورۃ ضابطۂ الٰہی اور دستور خداوندی کا جدا جدا باب اور الگ الگ شاہی فرمان ہے۔ جس کا سر تحریر اور سرورق بسم اللہ کی آیت رحمت اور فضل رحمانی کے سرکاری نشان سے اس طرح آراستہ کیا گیا ہے جس طرح سلاطین

[1] بسم اللہ سورتوں کے تاج ہیں۔

و ملوک کے مقتدر سروں پر شاہی تاج سجائے جاتے ہیں۔ صرف ایک سورت ایسی ہے جس کے شروع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ بسم اللہ کی تلاوت فرمائی اور نہ لکھنے کا حکم دیا۔ اور وہ سورہ توبہ" ہے۔ بسملہ بھی استعاذہ کی طرح آغاز تلاوت میں پڑھی جاتی ہے۔ لیکن استعاذہ قرآن کی ابتداء میں یا کسی سورۃ کے شروع میں لکھا ہوا نہیں ہے کیونکہ بالاتفاق استعاذہ قرآن کی آیت یا اسکا حصہ نہیں ہے۔

شعبیؒ اور اعمشؒ کی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزول بسملہ سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "بسمک اللھم" لکھوایا کرتے تھے جو اس زمانہ کا رواج تھا یہاں تک کہ قرآن کریم کی آیت "بسم اللہ مجریہا" نازل ہوئی تو اس کے بعد آپ نے بسم اللہ لکھوانا شروع کیا پھر جب آیت۔

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن یعنی پکارو اللہ کو اللہ کہکر یا رحمٰن کہہ کر

نازل ہوئی تو لفظ رحمٰن کا اضافہ ہوگیا۔ اور "بسم اللہ الرحمٰن" لکھوانے لگے۔

اور اس کے بعد جب "انہ من سلیمٰن وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" والی آیت نازل ہوئی تو آپ نے "بسملہ" کی پوری آیت پڑھنے اور لکھنے کا حکم دیا۔ اس آیت رحمت کے بہت سے خواص اور فضیلتیں احادیث میں مذکور ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم تمام سابقہ آسمانی کتابوں کے علوم کو اس طرح حاوی اور جامع ہے کہ گویا وہ کتب سماویہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اور کل قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے یعنی جتنے مضامین قرآن کریم میں تفصیل اور تشریح کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان سب کا اجمالی خاکہ اور خلاصہ سورۂ فاتحہ میں موجود ہے اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ آیت رحمت یعنی بسم اللہ میں موجود ہے جو دوسری سورتوں کی طرح سورۂ

فاتحہ کے شروع میں بھی پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ گویا کہ قرآن کریم کے جملہ مضامین کا اشارہ اور ایماء بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں موجود ہے اور اس سے بھی زیادہ کمالِ اعجاز یہ ہے کہ پوری بسم اللہ کا خلاصہ بسم اللہ کی "با" یعنی اس ایک حرف میں موجود ہے کیونکہ مفسرین کے ایک قول کی بنا پر اس "با" کے معنی ہیں "مصاحبۃ" اور "الحاق" یعنی ملانا، قریب کرنا۔ اور اگر غور کیا جائے تو قرآن کریم کے تمام مضامین اور اس کی تمام آیتوں کا بلکہ قرآن کریم کے ہر ہر جملہ کا ایک ہی منشا اور ایک ہی غرض و غایت ہے اور وہ بھٹکے ہوئے اور گمراہ انسان کو خدا سے ملانا اور انسان کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا، اور اللہ سے قریب کرنا ہے۔ آیتیں وعدہ کی ہوں یا وعید کی، مضمون رحمت کا ہو یا غضب الٰہی اور عذاب کا، تذکرہ جنت کا ہو یا جہنم کا، بیان نعمت کا ہو یا مصیبت کا، سب کی عبارتیں اور عنوان الگ الگ ہیں، مقصد اور ماحصل سب کا ایک ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ

وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے اپنے سارے دیوان اور اشعار کا خلاصہ صرف ایک شعر میں بیان کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے قرآن کا خلاصہ بسم اللہ کی "با" میں کس طرح سمو دیا گیا ہے ؎

میرا ہر اک سخن اسی مطلب کے ساتھ ہے

کم ہیں خدا کے ساتھ خدا سب کے ساتھ ہے

تلاوتِ قرآن سے پہلے اور استعاذہ کے بعد بسملہ کی غرض و غایت اور منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ رخنے اور رکاوٹ یا شیطانی وساوس سے

پناہ مانگنا کافی نہیں ہے جب تک کہ حق تعالےٰ کی رحمت وشفقت اور اس کی توفیق بھی شامل حال نہ ہو اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسملہ کی اہمیت اور اس کی تاثیر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا

"ہر اہم کام جو خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت اور ناتمام سا رہتا ہے"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کا کام ہو یا دین کا، چھوٹا ہو یا بڑا ہر کام کے شروع میں بسم اللہ کی تلاوت اور بسم اللہ سے اس کا آغاز کرنا ضروری ہے البتہ جو کام معصیت و نافرمانی سے متعلق ہو اس کا ارتکاب بھی بُرا۔ اور اس پر آیتِ رحمت کا تلاوت کرنا اس سے بھی زیادہ بُرا ہے پس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی اور بتلائی ہوئی خاصیت کے مطابق ہر مسلمان مرد، عورت، بچے اور بوڑھے کا شیوہ اور شعار ہونا چاہیئے کہ ہر کام کی ابتدا بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے کرے تاکہ ہمارا کام خیر و برکت سے پورا اور مکمل ہو جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکیمانہ ارشاد سے کہ ہر کام کی ابتدا اور اس کا آغاز "بسم اللہ" سے ہونا چاہیئے "بسملہ" کی غیر معمولی اہمیت اور اس کی رفعتِ شان کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاثیر اور افادیت تلاوت قرآن کی ابتداء میں برکت حاصل کرنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر اور ہر شعبے کے تمام دینی اور دنیاوی کاموں پر حاوی اور ہمہ گیر ہے قرآن و حدیث میں بعض کاموں کا خصوصیت کے ساتھ نام لے کر انکی ابتداء میں تلاوتِ بسم اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے

فَکُلُوۡا مِمَّا ذُکِرَ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ — پس اس ذبح کئے ہوئے جانوروں میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو۔

[1] کُلُّ اَمۡرٍ ذِیۡ بَالٍ لَمۡ یُبۡدَاۡ بِبِسۡمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَقۡطَعُ

دوسری جگہ فرمایا۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا

حضرت نوحؑ نے فرمایا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے گھر کا دروازہ بند کرو تو بسم اللہ پڑھ کر، اپنے گھر کا چراغ بجھاؤ تو بسم اللہ پڑھ کر، اور کھانا کھاؤ تو بسم اللہ پڑھ کر۔ وغیرہ

رہی یہ بات کہ ارشاد نبویؐ کے مطابق بسملہ کے بغیر ہر کام ادھورا رہنے اور بسملہ کی برکت سے پورا اور مکمل ہونے کا فلسفہ اور سبب کیا ہے؟ سو اس کا اندازہ آیت کے ترجمے اور اس کی تشریح کو سمجھے بغیر نہیں ہو سکتا۔

بسملہ کا ترجمہ یہ ہے۔

"شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے"

اس آیتِ رحمت یعنی بسم اللہ میں حق تعالیٰ کے ناموں میں سے خاص طور پر تین ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہی تین نام ہر کام کے شروع میں ہماری مدد کے لئے ضروری اور ناگزیر ہیں۔ جن سے ہر کام کے آغاز میں توفیق اور مدد مانگی گئی ہے اور جن پر تکمیلِ عمل کا دارومدار ہے۔

اَللّٰہ، رحمٰن[۲]، رحیم[۳]، لفظ اللہ خداوند قدوس کے ناموں میں سے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مشہور اور جامع نام ہے، اسی لئے عام طور پر حق تعالےٰ کی صفاتِ کمالیہ کو ظاہر کرنے والے الفاظ لفظ اللہ کے بعد ہی ذکر کیے جاتے ہیں۔

بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ لفظ خداوند قدوس کا ذاتی

اور شخصی نام ہے جس سے صرف اس کی ذات اور شخصیت مراد ہوتی ہے اور اس میں کوئی وصفی معنی ملحوظ نہیں ہیں۔ حضرات صوفیائے کرامؒ اور اولیاء اللہ نے لفظ اللہ کو اسم ذات قرار دیا ہے اسی کو اسم اعظم بھی کہا ہے۔

امام طحاویؒ نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی اسی کے مطابق نقل کیا ہے۔ خداوند قدوس کی ذات کے سوا اس لفظ کو کسی دوسرے کے لئے نہ استعمال کیا جا سکتا ہے اور نہ اس مفرد لفظ کی جمع بنائی جا سکتی ہے۔

بعض دوسرے اہلِ علم اور محققین کی یہ رائے ہے کہ یہ لفظ "اِلٰہ" سے یا "وِلَاہ" سے بنا ہے اور اس لفظ میں بھی وصفی معنی ملحوظ ہیں اگرچہ استعمال میں صرف ذاتِ خداوندی کے لئے مخصوص ہے، اور کسی پر یہ لفظ نہیں بولا جا سکتا۔ بہرحال یہ ذاتی نام ہو یا وصفی حق تعالیٰ کی ذات و صفات پر حاوی ہے۔ اور اس لفظ کے بولتے ہی موجودِ حقیقی اور موجدِ حقیقی یعنی خالقِ کائنات اور خالقِ اسباب کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور فوراً دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ پس مفہوم کی جامعیت کے باوجود اس لفظ میں خالقیت اور ایجاد کا پہلو غالب اور نمایاں ہے۔ اور ہر کام خواہ وہ دین کا ہو یا دنیا کا چھوٹا ہو یا بڑا اپنی ابتداء اور آغاز میں فراہمی اسباب اور سامان کو مہیا کرنے پر موقوف ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے بندہ اپنے عمل کو شروع کرنے کے وقت اس حاکم حقیقی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے جس نے ہماری حاجتوں کے لئے ساز و سامان اور اسباب پیدا کئے اور جس نے تخلیقِ اسباب سے ہمارے عمل کو ممکن بنا دیا۔

دوسرا لفظ رحمٰن ہے جو رحیم کی طرح لفظ رحمت سے بنا ہے

اور دونوں الفاظ کے معنی صاحب رحمت اور مہربان کے ہیں، عربی زبان کا ایک اصول ہے کہ الفاظ میں حروف کا جتنا جتنا اضافہ ہوتا چلا جائے گا اتنا ہی معنی میں زیادتی اور اضافہ ضروری ہے پس رحمٰن میں بہ نسبت رحیم کے مفہوم اور معنی کی مقدار زیادہ ہونی چاہیئے اس لئے بعض علماء نے صفت رحمٰن کا تعلق دنیا اور آخرت کی نعمتوں اور رحمتوں نیز مؤمن و کافر کے ساتھ قرار دیا ہے۔ اور صفتِ رحیم کا تعلق صرف آخرت کی نعمتوں اور اہلِ ایمان کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پس رحمٰن سے مراد وہ شفیق اور مہربان ذات ہے جو دنیا و آخرت میں ہمارے کاموں کی تکمیل میں مدد پہنچانے والی ہے، اور رحیم سے وہ مہربان ذات مراد ہے جو کسی کام کے آخر میں اچھے ثمرات اور نتائج پیدا کرنے والی ہے۔ اور عمل اور کام کی ابتدا کرنے والے کو تنہا وجودِ اسباب اور فراہمیِ سامان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، جب تک تکمیلِ عمل کی منزل تک اسباب کو بقا حاصل نہ ہو اور سامان کو استعمال کرنے کی توفیق نہ ہو۔ طلب بقا اور اسباب مانگنے کے لئے حق تعالیٰ کی صفت رحمٰن کا دروازہ کھٹکھٹانا ضروری ہے تاکہ ہمارا عمل اور ہمارا کام انجام پا سکے۔ نیز عمل کی تکمیل اور کسی کام کا اتمام صحیح معنی میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کام کی غرض و غایت اور اس کا صحیح نتیجہ اور ثمرہ بھی میسر نہ آ جائے تعمیر مکان کی غرض و غایت بالعموم سکونت اور رہائش اختیار کرنا ہے لیکن شدّاد کی جنت کی طرح اگر تکمیل کے بعد داخلہ اور قدم رکھنا میسر نہ آئے تو وہ کام اب بھی نا تمام اور نا مکمل ہے۔ اسی لئے عمل کی غرض و غایت اور اچھے ثمرات کے حصول کے لئے اللہ کی صفت رحیمی کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی ضروری ہے تاکہ عمل اپنے مقصد اور منشا کے لحاظ سے

بھی پورا اور مکمل ہو جائے۔
پس ان تین الفاظ سے تلاوت کرنے والا یا کاموں کی ابتدا کرنیوالا اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ اے خداوند قدوس جس کام میں آغاز کر رہا ہوں اس کے ابتدائی اسباب اور سامان کا خالق بھی تو ہی ہے اور اسباب و سامان کو استعمال کرنے کی توفیق دینے والا بھی تو ہی ہے۔ اور میرے کاموں پر اجر و ثواب اور اچھے نتائج پیدا کرنا بھی تیرے اختیار میں ہے۔ پس میرا یہ کام اللہ کی مدد رحمٰن کی توفیق اور رحیم کی مشفقانہ اعانت کے بغیر ممکن نہیں ؎

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

اس تشریح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ابتدائے عمل اور آغاز کار کے موقعہ پر اس سے بہتر کلمات اور حکیمانہ دعا، ممکن نہیں اور اس ایک آیت کے مفہوم سے پورے قرآن کریم کے اعجاز کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جس موقع پر اور جس جس عمل پر جو دعائیہ کلمات تجویز فرمائے ہیں اگر آپ ان کی حقیقت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر برمحل اور کتنے حکیمانہ ہیں۔
بعض علماء ربانیین نے "بسملہ" سے ابتداء اور آغاز کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ سلاطین و امراء کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب کوئی چیز اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں تو اس پر سرکاری نشان اور مہر لگا دیتے ہیں تاکہ عام رعایا کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ چیز شاہی اور سرکاری ہے اور وہ سرقہ اور چوری سے بھی محفوظ ہو سکے، اور

کوئی دوسرا آدمی اس میں تصرف بھی نہ کر سکے جیسے شاہی گھوڑے پر گرم لوہے سے ایک داغ اور نشان بنایا جاتا ہے۔ پس ایک بندہ جب کوئی کام یا عبادت شروع کرے تو اپنے اس عمل اور طاعت پر "بسملہ" کی مہر خداوندی اور نشان الٰہی لگا دینا چاہتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ کام احکم الحاکمین اور اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے اس بنا پر ایک مؤمن کو ہر کام اور ہر عمل سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر فتح العزیز میں "بسملہ" کو قرآن کریم اور کتاب اللہ کا دروازہ قرار دے کر ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ کسی عارف نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" لکھ کر میرے کفن میں رکھ دینا کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب میں ایک فقیر اور سائل کا واقعہ بیان کیا کہ اس نے کسی بلند اور شاندار دروازہ پر جا کر سوال کیا تھا تو اس دروازہ سے امید اور توقع کے خلاف نہایت معمولی اور حقیر چیز ملی تو فقیر واپس گیا اور پھر ایک کدال لے کر اس عظیم دروازہ کو ڈھانا شروع کیا۔ مالک کی مداخلت پر اس نے جواب دیا تو اپنی عطا کو یا تو دروازہ کے شایانِ شان بنا دے اور یا دروازہ کو اس حقیر عطا کے مطابق چھوٹا بنا دے۔

پس "بسم اللہ" بھی کتاب اللہ کا دروازہ ہے۔ میں قیامت میں اللہ سے التجا کروں گا کہ اس شاندار اور بلند دروازہ کے مطابق مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے نواز دے۔ بہر حال شاہانہ تاج کی طرح وہ سورتوں کی زینت ہو یا اس پر عمل کی تکمیل موقوف ہو یا سرکاری مہر اور شاندار دروازہ ہو، غرض ہر کام کی ابتدا اور ہر عمل کے آغاز پر بسم اللہ کا پڑھنا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اَلفَاتِحَۃ

قرآن کریم کی یہ نہایت اہم اور ابتدائی سورۃ ہے۔ جس سے قرآن کریم کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی لئے اس سورۃ کا مشہور نام "سورۃ الفاتحہ" ہے۔ اور عربی میں الفاتحہ کے معنی ہیں ابتداء اور شروع کرنے والی۔ گویا کہ یہ سورۃ فاتحۃ الکتاب اور فاتحۃ القرآن ہے لیکن وقوع اور آغاز قرآن سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں یہ سورت نازل بھی سب سے پہلے ہوئی ہے۔ جملہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ قرآن کریم کی ابتدائی سورۃ ہونے کے باوجود سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت نہیں ہے۔ جس طرح سورۃ الناس قرآن کریم میں سب سے آخری سورت ہونے کے باوجود نزول کے اعتبار سے سب سے آخری سورۃ نہیں ہے" بلکہ سب سے پہلے جن آیتوں سے نزول وحی کا آغاز ہوا ہے وہ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ — پڑھ تو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں اور قرآن کریم کا وہ حصہ جو سب سے آخر میں نازل ہوا ہے اس میں معمولی سا اختلاف ہے بعض علماء نے لکھا ہے کہ آخری حصہ

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ — آج کامل کر دیا میں نے تمہارے لئے دین تمہارا

وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ اور کامل کر دیں میں نے تم پر اپنی نعمتیں

سورۂ مائدہ کی وہ آیت ہے جس میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر تکمیلِ دین اور اتمام نعمت کی خوش خبری سنائی گئی تھی جس کو سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رونے لگے کسی کے دریافت کرنے پر رونے کی وجہ یہ بتلائی کہ جب کوئی چیز انتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو قدرتی طور پر اندیشۂ زوال پیدا ہو جاتا ہے (ان کی مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وصال سے تھی)۔ چودھویں رات کا بدرِ کامل اگلی رات سے رُو بزوال ہو جاتا ہے یہ حقیقت شناسی اور معرفت کا نہایت دقیق نکتہ ہے کہ غایت زوال پر کمال کی ابتداء محسوس ہونے لگے اور کمال کی انتہا پر زوال کا احساس پیدا ہو جائے۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر اسی عارفانہ نکتہ کا آئینہ دار ہے ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

بعض علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کا آخری حصہ "سورۂ نصر" ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے تشریف لیجانے اور آپ کے وصال کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں رائیں اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں، اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیتوں میں سب سے آخری آیت سورۂ مائدہ کی آیت ہے۔ اور قرآن کی سورتوں میں سب سے آخری سورۃ "سورۂ نصر" ہے۔

اس موقعہ پر اس امر کا ظاہر کر دینا بھی نامناسب اور بے محل نہ ہوگا کہ قرآن کریم کی جمع و تلاوت کی ترتیب اور ہے اور اس کی

ترتیب نزولی دوسری اور اس سے مختلف ہے۔ اور یہ فرق کسی
اتفاقی حادثہ کی بنا پر یا کسی کے شخصی تصرف اور تجویز کی بنا پر
نہیں ہے۔ بلکہ جس قرآن کے الفاظ اور اس کی آیتیں اللہ کی وحی
ہیں۔ اسی طرح قرآن کی ترتیب جمع بھی اللہ کی وحی سے وابستہ
اور متعلق ہے۔ چنانچہ جب کوئی آیت، کوئی ٹکڑا اور کوئی جزء نازل
ہوتا تھا تو آپ کاتبین وحی سے اس تفصیل ہدایت کے ساتھ
لکھواتے تھے کہ فلاں آیت سے پہلے، فلاں آیت کے بعد اور فلاں
سورۃ میں اس کو لکھا جائے۔ پس قرآن کریم جس ترتیب سے جمع کیا
گیا ہے اس کی ہدایت نزول قرآن کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم خود دیتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ہدایت بھی وحی
الٰہی پر مبنی تھی۔ اسی وجہ سے قرآن کریم کی موجودہ ترتیب جمع
میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ موجودہ ترتیب کے خلاف نماز
میں تلاوت کرنے کی اجازت ہے۔ رہی یہ بات کہ اگر اللہ کا منشاء
اسی موجودہ ترتیب جمع اور ترتیب تلاوت کے حق میں تھا جیسا کہ اللہ
نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ آگاہ فرمایا تو نزول
قرآن میں بھی اسی ترتیب کو کیوں ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ سو اس کی
وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کی ترتیب کی بناء اور ہے اور جمع و تلاوت
کی ترتیب کا مبنیٰ کچھ اور ہے۔ دراصل وہ قرآن جو تیئیس سال کے
طویل عرصہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر
نازل ہوا وہ بعینہ نقل ہے۔ لوح محفوظ کی جیسا کہ قرآن کریم کی ایک
آیت میں اسکی وضاحت کی گئی ہے "بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ"
لوح محفوظ سے جتنا حصہ اور جس وقت نازل ہوا وہ وقت
حالات اور حکمت کے مطابق تھا۔ کبھی آخر سے اور کبھی وسط اور ابتدا

سے۔ جب نازل شدہ آیات کو جمع کرنے اور تلاوت کے لئے ترتیب کا سوال سامنے آیا تو اس کی ترتیب نزول کے مطابق نہیں بلکہ لوحِ محفوظ کی اصل کے مطابق قرار پائی، گویا کہ نزول کی ترتیب اپنی مصلحت کے مطابق صحیح ہے اور جمع و تلاوت کی ترتیب اصل و نقل کی مطابقت کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اس مسئلہ کو اگر کسی تمثیل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ زیادہ آسانی اور سہولت سے سمجھ میں آ جائے کیونکہ تمثیل کا طریقہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بھی اختیار کیا ہے لہٰذا فرض کیجئے کہ ایک حاذق اور مشہور طبیب کے پاس مجرب اور نایاب نسخوں کا مجموعہ اور بیاض ہے جس میں سر کے امراض سے لیکر پاؤں کی بیماریوں تک ایک خاص ترتیب کے ساتھ نسخے جمع کئے گئے ہیں۔ دورانِ علاج اگر امراض شکم کا مریض اپنی بیماری کا اظہار کرتا ہے تو اس کو مقتضائے حال کے مطابق بیاض کے درمیانی حصہ سے پیٹ کی بیماری کا نسخہ دیا جائے گا۔ علیٰ ہذا دوبارہ اگر اس مریض کو پاؤں کی کوئی بیماری پیش آتی ہے تو اس کے مرض کے مطابق بیاض کے آخری حصہ کا نسخہ دیا جائے گا۔ اسی طرح مختلف امراض اور بیماریوں کے نسخے مختلف اوقات میں دیئے جائیں گے۔ اب یہ مریض جب اپنے تمام نسخوں کو کتابی شکل میں جمع کرے گا تو اپنے علاج کی ترتیب سے نہیں بلکہ اپنے معالج کی اصل بیاض کی ترتیب کے مطابق جمع کرے گا۔ پس معلوم ہوا کہ نسخوں کی علاج والی ترتیب اور ہے اور ان کو کتابی شکل میں مدون کرنیکی ترتیب دوسری ہے۔ پس آیاتِ قرآنی کا نزول وقت اور حالات کے مطابق ہے یا دوسرے لفظوں میں روحانی علاج اور اصلاح کے تقاضوں پر مبنی ہے اور جمع و تلاوت کی ترتیب لوح محفوظ کی مطابقت پر مبنی ہے جسکی ہدایت خود اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کو بذریعہ وحی دی۔
اس "الفاتحہ" نام کی توجیہ کے سلسلے میں بعض علماء نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ آیتوں میں نزول کے اعتبار سے سب سے پہلی آیات سورہ "اقراء" کی ابتدائی آیتیں ہیں اور سورتوں میں سب سے پہلی نازل ہونے والی سورت سورۂ فاتحہ ہے۔ اس نام کے علاوہ بڑے جلیل القدر اور مستند مفسرین نے بیس سے کچھ زیادہ اس سورۃ کے نام نقل کئے ہیں۔ بعض مفسرین نے بارہ کی تعداد میں نام بتلائے ہیں جن میں سے کچھ متفق علیہ ہیں اور بعض ناموں میں مفسرین کا باہم اختلاف ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ اس سورۃ کے جتنے کثیر نام ہیں اتنے قرآن کریم کی کسی سورۃ کے بارے میں منقول نہیں ہیں اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ عظمت و بزرگی اور معنوی خصوصیات کے لحاظ سے جو اعلیٰ اور بلند مقام قرآن کریم کی اس سورت کو حاصل ہے وہ کسی اور سورۃ کو نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابوسعید بن المعلیٰ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ کہ مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی۔ نماز میں مشغولیت کی وجہ سے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب نہ دے سکا۔ یہاں تک کہ میں جب نماز سے فارغ ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر جواب نہ دینے کی معذرت پیش کی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں اللہ کا یہ حکم نہیں معلوم کہ اللہ کا رسول جس حالت میں بھی تمہیں پکارے۔ تو تمہارے لئے جواب دینا ضروری ہے۔ اور یہ آیت پڑھ کر آپ نے سنائی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ	اے ایمان والو تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجا لایا کرو۔ جبکہ رسول تمکو تمہاری زندگی

لِمَا یُحْیِیْکُمْ — بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں۔

پھر آپ نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ آؤ کہ مسجد سے باہر جانے سے پہلے پہلے میں تمہیں ایک سورت سکھلاؤں گا۔ جو قرآن کریم میں سب سے زیادہ معظم ترین سورت ہے۔

ابو سعید بن المعلی کہتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک اپنے ہاتھ میں لئے چلتا رہا۔ جب مسجد سے باہر آنے کی منزل آئی تو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلایا کہ قرآن کریم کی عظیم ترین سورت کی تعلیم کا آپ نے وعدہ فرمایا تھا اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فاتحہ کی تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ یہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظیم ترین سورت ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جتنی ذات اور مسمیٰ کی عظمت زیادہ ہوتی ہے اس کے نام اور اسماء بھی زیادہ ہوتے ہیں، اسی اصول کے لحاظ سے سب سے زیادہ نام خداوند قدوس کے ہیں کہ ساری عظمتیں اور بڑائیاں اس پر ختم ہیں۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — اور اسی کی بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔

اور اللہ تعالیٰ کے بعد ہر قسم کی عظمت اور بڑائی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتی ہے۔ جن کی شان گرامی میں اس سے بہتر نعت اور تعریف نہیں ہو سکتی ؎

شاباش آں صدف چناں پر دُر دگہر
آبا را ز وئے کرم و ابنا عزیز تر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے بعد سب سے زیادہ نام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کلام اللہ (صفت الٰہی) کے ہیں اور اس مقام اور جگہ کے بھی متعدد نام ہیں جو حق تعالیٰ کی تجلیات کا اور اس کی عظمتوں کا سب سے زیادہ بڑا مرکز ہے۔ یعنی بیت اللہ اور خانہ کعبہ۔ جیسا کہ اس کے ناموں میں مکہ، بکہ، اُمّ القُریٰ، عروض تھامہ وغیرہ نام نقل کئے گئے ہیں۔

پس اللہ، رسول اللہ، کلام اللہ اور بیت اللہ درجہ بدرجہ اپنی اپنی عظمت کے لحاظ سے مختلف اور متعدد ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ قرآن کی سورتوں میں سب سے زیادہ عظمت چونکہ سورۂ فاتحہ کو حاصل ہے اس لئے اس کے کثیر نام نقل کئے گئے ہیں انہی ناموں میں سے "ام الکتاب" اور "ام القرآن" بھی ہیں عربی میں "ام" کے معنی ہیں کسی چیز کی اصل اور مرکز، اس لئے عربی میں کھجور کی گٹھلی کو "ام النخلہ" اور دماغ کو "ام الرأس" کہتے ہیں کیونکہ دماغ تمام انسانی حواس کا مرکز ہے اور گٹھلی کھجور کے درخت کا ایک اجمالی خلاصہ اور ماحصل ہے۔ جس طرح ایک بیج اور گٹھلی میں درخت کے تنے، پتے، پھول، پھل اور جڑیں وغیرہ اجمالی اور مجموعی طور پر سب چیزیں جمع ہوتی ہیں، اسی طرح سورہ فاتحہ بھی اپنے مضامین کے لحاظ سے پورے قرآن یا تمام کتب سماویہ کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ام کا لفظ ماں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو اولاد کے لئے اصل اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے پس ام القرآن یا ام الکتاب کا مطلب یہ ہے کہ اجمال اور خلاصہ کے طور پر جو اصل مضامین اس سورت میں آچکے ہیں ان کی تفصیل پورے

قرآن میں بعد میں آنے والی ہے۔ جس طرح اولاد کا مرتبہ ماں کے بعد ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے قرآن کریم کی یہ سورت ایسی ہے جیسے کسی ضخیم کتاب کا دیباچہ یا کسی کتاب کی فہرستِ مضامین، اس لئے تلاوت اور جمع کی ترتیب میں یہ سورت سب سے پہلے رکھی گئی۔

بعض مفسرین نے ام کے ایک اور معنی بھی نقل کئے ہیں لکھا ہے کہ اہلِ عرب لشکر کے اس مرکزی پرچم کو بھی ام کہتے ہیں جس کے نیچے سارا لشکر پناہ لیتا ہے۔ پس ام القرآن، لشکریانِ اسلام کا وہ روحانی اور مرکزی پرچم ہے جس کے سایہ میں وہ اس طرح پناہ لیتے ہیں۔ جس طرح فوجیں اپنے جھنڈے اور پرچم کے نیچے پناہ پکڑتی ہیں اس سورت کے مشہور ناموں میں سے ایک نام "سورۂ شفا" بھی نقل کیا گیا ہے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

هِیَ شِفَاءٌ مِنْ کُلِّ دَاءٍ — وہ ہر مرض کیلئے شفا ہے۔

یعنی یہ سورت ہر بیماری اور مرض کے لئے مجسم شفاء اور اکسیر ہے نفسانزدل کے اعتبار سے روحانی امراض کیلئے بھی اور برکت و تاثیر کے اعتبار سے جسمانی امراض کیلئے بھی کیونکہ قرآن کریم میں کفر و نفاق کو بھی مرض اور بیماری فرمایا گیا ہے۔

فِی قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا — ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے سو اور بھی بڑھا دیا اللہ تعالٰی نے ان کا مرض

سورۃ کے مذکورہ بالا مختلف الانواع اور متعدد ناموں سے بھی سورۃ کے مضمون اور اس کے مفہوم کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا تاہم غیر مبہم اور واضح الفاظ میں مقصد اور مضمون کا تعین ضروری ہے یہ سورۃ درحقیقت ایک دعا، مناجات اور فدویانہ معروضہ و درخواست ہے۔ جو ایک بندہ کی طرف سے خداوند قدوس کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے۔ اسی لئے اِس سورۃ کے ناموں میں سے ایک

نام "سورۃ الدعاء" بھی ہے۔ اور نماز جو فی الواقع دربار عالی وقار میں پنج وقت حاضری کا دوسرا نام ہے اس میں بھی اسی مفہوم کی بنا پر اس سورت کی تلاوت کو واجب اور ضروری قرار دیا گیا ہے اور اسی مناسبت سے " سورۃ الصلوٰۃ " بھی اسی سورۂ فاتحہ کو کہا جاتا ہے۔ سورۃ کے اس مقصد اور مفہوم کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس سورۃ کے ناموں میں سے "سورۃ المسئلہ" اور "سورۃ السوال" بھی ہیں۔ جن کا ترجمہ ہی فدویانہ عرضی اور درخواست ہوتا ہے، گویا کہ حق تعالےٰ اس سورۃ میں اپنے بندوں کو عرضی پیش کرنے، درخواست دینے اور مانگنے کا طریقہ سکھلا رہے ہیں۔

یہاں سے اللہ کی شان کریمی اور اس کی بے مثال فیاضی کا کا اندازہ لگائیے، کہ اسے بندگان بارگاہِ قدس، اور گدایان آستانہ ربوبیت کی اس سادگی اور معصومیت پر رحم آتا ہے کہ مجسم احتیاج اور سرتاپا نیاز ہونے کے باوجود انہیں مانگنے کا طریقہ، سوال کا ادب اور صدا لگانے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا، اللہ نے "سورۃ السوال" کو نازل فرما کر اپنی بے پایاں رحمت و شفقت کی اس طرح تکمیل فرما دی کہ بندوں کو جھولی بھی دیدی اور مانگنے کا ڈھنگ بھی سکھا دیا۔[۵]

ہم بدل ہا می نماید خویش را
ہم بدوزد خرقۂ درویش را

فدویانہ عرضی و درخواست کا کامل و مکمل خاکہ یہ ہے کہ:-

ایسے وقیع، پرشوکت اور جاذب کرم شاہی القاب سے عرضی کو شروع کیا جائے۔ جن میں آقا کی عظمت، اس کا اقتدار اور اس کی شان کریمی کی جھلک نظر آ رہی ہو۔

پھر عرضی گذار اور فدوی اپنا تعارف کرانے کے لئے اپنی سرکاری خدمات، نیازمندی، نمک خواری، درِ کریم سے وابستگی اور اپنی وفاشعاری کا اظہار کرتا ہے۔

پھر آمدم برسرِ مطلب کے مطابق حرفِ مدّعا اور مقصد درخواست کا اظہار ہوتا ہے۔ جس کی خاطر یہ پوری عرضی تیار کی گئی ہے۔

پھر جس احکم الحاکمین کی بارگاہ میں معروضہ پیش کیا جا رہا ہے اس کے وفادار اور حامیوں کے ساتھ اپنی دلچسپی تعاون اور دوستی کا اظہار کیا جائے۔

اور مخالفین و باغیوں کے ساتھ اپنی مکمل بیزاری اور برأت کے اعلان پر عرضی کو تمام کیا جائے۔

چنانچہ اَلحَمدُ لِلّٰہِ سے "مَالِکِ یَومِ الدِّین" تک آقائے نامدار اور دونوں جہاں کے پروردگار کے شاہی القاب و آداب ہیں۔

"اِیَّاکَ نَعبُدُ وَاِیَّاکَ نَستَعِین" میں بندہ کا اپنا فدویانہ اور نیازمندانہ تعارف ہے۔

"اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیم" حرفِ مطلب اور حرفِ مدعا ہے۔

"صِرَاطَ الَّذِینَ اَنعَمتَ عَلَیھِم" میں وفاشعار اور حامیوں کے ساتھ دوستی کا اظہار ہے۔

اور "غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیھِم وَلَا الضَّالِّین" میں باغیوں سے بیزاری کا اعلان ہے ؎

جو عدو باغ ہو برباد ہو ۔۔۔ کوئی ہو گلچیں ہو یا صیاد ہو

عرضی و مناجات کا جو طریقہ سورۂ فاتحہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ

نے ہمیں عطا فرمایا ہے وہ اپنی جگہ اس قدر اکمل ترین اور متوازن ہے کہ اس سے بہتر کا تصور دنیا میں ممکن نہیں، کیونکہ ایک طرف لوہیت وکبریائی کا پورا پورا مظاہرہ ہے اور دوسری طرف عبدیت ونیاز مندی کا پورا پورا اعتراف، اظہار عبدیت کا اندازہ ایسا دل گداز اور جاذب ہے کہ چشم عنایت اور نگاہِ کرم کو بھی بے چین کردے۔ ع

دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

شان کبریائی اور ربوبیت کا اظہار بھی کچھ ایسے عنوان سے کیا گیا ہے کہ مانگنے والے کو دستِ کرم کی جھلک اور بخشش کا رخ نظر آرہا ہے ۵

رحمتِ حق بہا نہ مے جوید رحمت حق بہا نمی جوید

ادھر حق تعالےٰ کی جلالی وجمالی اور رحمت وغضب کی دونوں شانیں بھی بیان کردی گئیں۔ اُدھر بندہ کا یہ حال بھی بتلا دیا گیا کہ وہ اس کا دوست ہے جو اللہ کا دوست ہے اور اس کا دشمن ہے جو خدا کا دشمن ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث قدسی نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کردی ہے جب بندہ۔ "الحمد للہ" کہتا ہے تو حق تعالےٰ فرماتے ہیں "حمدنی عبدی" میرے بندہ نے میری حمد بیان کی اور جب "الرحمٰن الرحیم" کہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں "اثنیٰ علی عبدی" میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ اور جب بندہ "مالک یوم الدین" کہتا ہے تو حق تعالےٰ فرماتے ہیں "مجدنی عبدی" میرے بندہ نے میری بزرگی بیان کی۔ اور جب

جب کہتا ہے "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ"، تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں، ھٰذا بینی و بین عبدی و لعبدی مَا سَأَلَ کہ یہ جملہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک ہے اور جو کچھ میرے بندے نے مانگا وہ منظور کر لیا گیا۔ اور جب بندہ کہتا ہے۔ "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" سے وَلَا الضَّآلِّیْنَ" تک تو حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ یہ میرے بندے کا معاملہ ہے اور میں نے اپنے بندے کو جو کچھ اس نے مانگا وہ دیدیا، بہرحال مذکورہ بالا تشریح سے یہ معلوم ہو گیا کہ "سورۂ فاتحہ" ہر پہلو سے بندے کی ایک عرضی اور درخواست ہے جو اللہ کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے اور جو حسب تفصیل بالا پانچ اجزار پر مشتمل ہے۔ آئندہ انہی پانچ اجزا کو الگ الگ باب اور فصل کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

القاب

سورۂ فاتحہ میں تبلائی ہوئی فدویانہ عرضی اور درخواست کا پہلا حصّہ اور ابتدائی جزو خداوند قدوس اور آقائے حقیقی کے شاہانہ القاب وآداب سے متعلق ہے۔ جو اس وقت ایک مستقل باب کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

القاب وآداب کی غرض وغایت اور اس کا اصول یہ ہے کہ سرعنوان آقا کے ایسے اوصاف اور ایسے کمالات کا اظہار کیا جائے جو اصل مدعا سے میل کھاتے ہوں۔ اور مقصد درخواست سے ہم آہنگ ہوں۔ اگر درخواست کا مقصد امداد حاصل کرنا ہے۔ تو شجاعت وبہادری اور علمی وفنی اوصاف کا ذکر بے محل ہوگا بلکہ اس موقع پر جود وسخا کے الفاظ اور داد ودہش کے اوصاف کا ذکر ہی مناسب ہے اور اگر دادرسی اور انصاف طلبی کی درخواست ہے تو صفاتِ عدل کا اظہار مناسب ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس یہ سمانی مناجاۃ اور اللہ کی طرف سے بندوں کو تلقین کی ہوئی درخواست جس کا اصل مقصد اور حاصل مدّعا راہِ مستقیم کی ہدایت ہے، اس میں ایسے القاب واوصاف مذکور ہیں جو مقصود کے عین مطابق بھی ہیں اور جذبات پذیرائی کے حامل بھی۔ چنانچہ سلسلۂ القاب کا آغاز حق تعالےٰ کی حمد سے کیا گیا۔ اور حمد باری سے ابتداء کرنا خود مفہوم حمد کے عین مطابق بھی۔ حمد باری کے بعد صفتِ ربوبیت

پھر کمال رحمت اور آخر میں جزا و سزا پر قدرت کاملہ اور حق تعالیٰ کی احتسابی شان کو بیان کیا گیا۔ حمد باری تعالیٰ سے فاتحہ کے آغاز کا قدرتی حاصل یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ اور قرآن کریم کا آغاز بھی کلمات حمدیہ ہوا ہے کیونکہ سورہ فاتحہ سے ہی قرآن کریم کا بھی آغاز ہوتا ہے

اور کلمات حمد جس طرح ابتداء اور آغاز کے کلمات ہیں اسی طرح یہ تکمیل اور انتہاء کے کلمات بھی ہیں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
کہ ان کی زبانوں پر آخری کلمہ الحمد للہ رب العالمین ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابتداء اور انتہاء آغاز اور انجام دونوں ہی کا تعلق کلمات حمد سے ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ انتہا کسے کہتے ہیں۔ جواب دیا کہ اَلرُّجُوْعُ اِلَى الْبِدَايَةِ یعنی ابتداء کی طرف لوٹنا۔ باقی حمد کے معنی زبان سے تعریف کرنا یا مدح و ستائش کے ہیں، اور حمد کے اوپر جو الف لام ہے اس کے بارے میں مفسرین کے بیشمار اقوال ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ان میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ الف لام استغراق اور احاطہ کے معنی میں ہے یعنی آسمان و زمین میں جہاں جہاں حمد و ثنا پائی جاتی ہے خواہ وہ کسی انداز اور عنوان سے ہو وہ سب حقیقت میں اللہ کی تعریف اور اسی کی ستائش ہے۔ کیونکہ ساری کائنات، کائنات کی ہر مخلوق اور مخلوق کا حسن و کمال اس کا اپنا ذاتی اور خانہ زاد نہیں ہے بلکہ اللہ کی دین اور اس کی عطا ہے۔

مصنوعات کی تعریف درحقیقت صانع حقیقی اور خالق کی

تعریف ہے۔ پس اللہ کے سوا کسی باکمال، باہنر اور حسین کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خود کو حمد و ثناء کا مستحق سمجھے۔ کیونکہ حسن خوبی و کمال پر تحسین و آفرین کی جارہی ہے وہ حق تعالے کی کمال اور اس کے جمال کا معمولی سا پرتو اور عکس ہے اسی لئے پوری کائنات کو صفات خداوندی کا مظہر اور مثالی عالم کہا جاتا ہے پس "الحمدللہ" میں ایک بندہ اور فدوی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ہر قابل تعریف اور مستحق آفریں امر کا حقیقی سرچشمہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ اس لئے حمد، اللہ ہی کے لئے مخصوص ہوئی۔ اور جس طرح حمد ذات باری تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اسی طرح لفظ حمد کے بعض دوسرے پہلو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کیلئے مخصوص ہیں۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی میں سے وہ نام جو آپ کے دادا خواجہ عبدالمطلب نے خاندان کیطرف سے ولادت باسعادت کے ساتویں دن رکھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس نادر اور انوکھے نام کو سنکر قریش کے بعض افراد نے حیرت سے یہ سوال کیا کہ ایسا نام ہمارے آباؤ اجداد میں اب تک نہیں سنا گیا۔

صاحب فتح الباری نے خواجہ عبدالمطلب کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ میں نے یہ نام اس لئے رکھا کہ اللہ آسمان میں اور خلق خدا زمین میں اس بچہ کی حمد و ثنا کرے اور اس کا پس منظر خواجہ عبدالمطلب نے اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور کی ولادت مبارک سے پہلے انھوں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ان (عبدالمطلب) کی پشت سے ایک زنجیر ظاہر ہوئی ہے جس کے چار سرے ہیں ایک

سرا آسمان میں ہے اور ایک زمین میں ایک مشرق میں ہے اور ایک مغرب میں۔ پھر اس زنجیر نے ایک درخت کی صورت اختیار کر لی جس کا ہر پتہ آفتاب کے نور سے زیادہ روشن ہے۔ کچھ لوگ اس کی شاخوں کو محفوظ طریقے پر پکڑے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ اس کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کاٹنے کی کوشش میں ہیں ان کو نہایت حسین وجمیل جوان آکر ہٹا دیتا ہے۔ تعبیر دینے والوں نے خواجہ عبدالمطلب کے اس خواب کی یہ تعبیر دی کہ ان کی نسل سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جس کے نام لینے والے اور فدائی مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلے ہوئے ہوں گے اور آسمان وزمین والے اس کی حمد و ثنا بیان کریں گے۔ اس لئے اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھا جائے جس کے معنی ہیں وہ ذات جس میں ہر پہلو قابلِ حمد اور قابل ستائیش ہو۔ پس محمد کا ماخذ اور اس کی اصل لفظ "حمد" ہی ہے۔ امام بخاری نے تاریخ صغیر میں علی بن زید کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا خواجہ ابوطالب حضورؐ کے اسم گرامی کے بارے میں حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

وَشَقَّ لَہٗ مِنْ اِسْمِہٖ لِیُجِلَّہٗ
فَذُوالْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَّھٰذَا مُحَمَّدٌ

یعنی حضور کی عظمت وشان کو بڑھانے کے لئے اللہ کے نام کو ماخذ بنا کر آپ کا نام تجویز کیا گیا، پس اللہ کا نام محمود ہے اور اس کے نبی کا نام محمد

آپ کا دوسرا نام جس کی بشارت پانچ سو سال پہلے حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی تھی وہ "احمد" ہے

اور وہ بھی اسی لفظ حمد سے بنا ہے جس کے معنی ہیں سب سے زیادہ حمد بیان کرنے والا۔ اور بعض اہل معرفت علماء کی یہ رائے ہے اور بالکل صحیح ہے کہ حضورؐ کے یہ دو نام دراصل آپ کی دو مختلف کیفیتوں اور دو الگ الگ شانوں کے مظہر ہیں ایک سے اس کیفیت کا اظہار ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر اپنے عرش والے آقا کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں اور اس کے اوصاف و کمال کا اظہار کرتے ہیں اور دوسرے سے آپ کی اس شان کا اظہار ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے اس حبیب کے اوصاف و کمالات کو بیان فرماتے ہیں اور اس کی تعریف و حمد کرتے ہیں جیسے زمین پر اپنا نبی اور رسول بنا کر بھیجا۔ پہلی کیفیت کا مظہر آپ کا اسم گرامی "احمد" ہے اور دوسری شان کا مظہر لفظ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ کیونکہ آپ سب سے زیادہ اللہ کی حمد بیان کرنے والے بھی ہیں اور اللہ کی طرف سے آپ کی حمد اور تعریف بھی کی گئی ہے، اسی بنا پر میدان حشر میں جو جھنڈا اور پرچم آپ کی خصوصیت اور امتیازی شان کو ظاہر کرنے والا ہوگا اس کا نام حدیث میں "لواء الحمد" بتایا گیا ہے اور عزت و سربلندی کا وہ نمایاں مقام جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں دیا جائے گا۔ اس کا نام "مقام محمود" ہوگا۔ اور حدیث میں آتا ہے کہ اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کا لقب قیامت میں "حمّادون" ہوگا جس کا ترجمہ ہے۔ بہت زیادہ اللہ کی حمد بیان کرنے والے۔

پس جس طرح حمد اللہ کے لئے مخصوص ہے اسی طرح حمد سے وابستہ اور متعلق بہت سے پہلو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کی امت کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اس روحانی مناجات اور آسمانی عرض کے شاہانہ القاب کا دوسرا جزو "رب العالمین" ہے جس میں حمد الٰہی کے بعد حق تعالےٰ شانہ کی صفت ربوبیت کا بیان ہے اور حمد و ربوبیت کے اظہار میں ایسی لطیف ترتیب اور ترتیب میں ایسا باریک نکتہ ملحوظ ہے جو صرف اللہ ہی کے کلام میں ہو سکتا ہے اور انسانوں کی قدرت و دسترس سے باہر ہے وہ یہ کہ الحمد للہ میں ہر قسم کی حمد و ستائش کو صرف اللہ کے لئے مخصوص کیا گیا۔ اور رب العالمین میں اس تخصیص کی وجہ اور اس کی بنا بتلائی گئی ہے کہ اسکی کریمانہ تربیت اور مربیانہ کفالت میں ہمارا اور ساری کائنات کا بال بال بندھا ہوا ہے۔ جب اس کی ربوبیت میں کسی کا حصہ نہیں ہے، تو حمد و ستائش میں شرکت کا بھی کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

لفظ "رب" اللہ کے صفاتی ناموں میں سب سے زیادہ مشہور اور غیر معمولی اہم نام ہے جو لفظ اللہ اور رحمٰن کی طرح خداوند قدوس کی ذات کے سوا کسی کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ جاہلیت میں سلاطین و ملوک کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ البتہ اگر اس کے ساتھ کوئی ایسا لفظ لگا دیا جائے جس سے ہمہ گیر ربوبیت باری کا مفہوم باقی نہ رہے تو غیر اللہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جیسے رب البیت، گھر کا مالک یا ربُّ المال مال کا مالک وغیرہ۔

اس وصفی نام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق اور کائنات کی آفرینش سے پہلے عالم ارواح میں عہد الست کے موقع پر سب سے پہلے اللہ کے جس وصف سے انسانوں کے کان آشنا ہوئے ہیں وہ اس کی شان ربوبیت ہے۔ جیسا کہ حق تعالےٰ

نے قرآن کریم میں ان الفاظ سے وضاحت فرمائی ہے "
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا یعنی اللہ نے پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، ارواح انسانی نے جواب دیا کہ ہاں کیوں نہیں
بَلٰی

پس جس طرح عالم اجسام میں پیدائش کے بعد سب سے پہلے بچہ کے کان میں اذان واقامت کے ذریعہ توحید کی آواز پہنچائی جاتی ہے۔ اسی طرح عالم ارواح میں بھی سب سے پہلے صفت ربوبیت کے اظہار سے ارواح میں بنی آدم میں معرفت و خداشناسی اور توحید کی تخم ریزی کی گئی۔ گویا کہ ربوبیت کا وصف ہماری توحید کی ابجد اور معرفت وخداشناسی کی بسم اللہ ہے۔ عربی میں اس لفظ کا ماخذ بھی "رب" ہے جس کے معنی ہیں حیات و زندگی کی ہر ہر ضرورت اور ہر مصلحت کا ضامن اور کفیل ہونا۔ اس ماخذ کی مناسبت سے رب کا ترجمہ۔ مربی، نگراں، اور کفیل جیسے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔

چنانچہ رب الفرس و رب الابل گھوڑے اور اونٹ کے ان مالکوں کو کہا جاتا ہے جو ان کے مالک بھی ہیں اور ان کی تمام ضرورتوں کے مربی و کفیل بھی۔

ربوبیت کے مفہوم کی دوسری تعبیر اس طرح کی جاتی ہے کہ کسی چیز کو آہستہ آہستہ اور بتدریج ابتداء سے انتہا اور حد کمال تک پہنچانا۔ جیسے مالی اور باغبان کہ پہلے زمین میں بیج ڈالتا ہے اور جب نیست سے ہست کرنیوالا اللہ اپنی قدرت کاملہ سے بیج اور گٹھلی کے اندر سے ہرے ہرے پتوں والا نازک سا پودا اگا دیتا ہے تو مالی گرم اور سرد ہوا کے تھپیڑوں سے اور مویشی اور چرندوں کی خورد وبرد سے اس کی حفاظت ونگرانی کرتا ہے اور اپنی تدبیر و محنت اور

آبیاری سے اسے حد کمال تک پہنچا کر بار آور بنا دیتا ہے یا جیسے اولاد کے حق میں ماں اور باپ جن کی پرورش و تربیت اور مربیانہ حیثیت کا ذکر خود حق تعالے نے قرآن کریم میں بھی فرمایا ہے۔

وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

اور یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا ہے

یعنی کہ اے انسان تو اپنے والدین کے حق میں اللہ سے یوں دعا مانگ کہ اے میرے رب تو میرے والدین پر ایسی ہی شفقت اور مہربانی فرما جس طرح میرے بچپن میں انھوں نے شفقت و مہربانی سے مجھے پالا ہے یا جیسے ملک و ملت کے حق میں سلطان و بادشاہ کہ وہ ملک و ملت کا محافظ و نگراں بھی ہے اور عام ضروریات و حوائج میں فی الجملہ مربی و کفیل بھی۔

علی ہذا آفتاب و ماہتاب بھی حرارت و خنکی اور برودت و نرمی کے اپنے اپنے وسیع علقوں اور دائروں میں مدبر و نگراں اور مربی و کفیل کا درجہ رکھتے ہیں۔

پس ربوبیت و پرورش کی جھلک ماں باپ میں بھی ہے اور باغ کے مالی و باغباں میں بھی۔ بادشاہ و امیر لشکر میں بھی ہے اور آفتاب و ماہتاب میں بھی۔

ان کے علاوہ ربوبیت و پرورش کا یہ رنگ اور تدبیر و کفالت کی یہ جھلک آسمان و زمین کی بے شمار دوسری موجودات اور موجودات کی ہر نوع میں بھی اسی طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ حکماء اشراقین کے نزدیک موجودات عالم میں ہر مخلوق کے لئے ایک روح مدبرہ ہے جو اپنے محدود دائرہ اور حلقے میں مصلح اور مربی کا درجہ رکھتی ہے۔ جسے وہ اپنی اصطلاح میں رب الفرد یا رب النوع کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض سطحی اور سرسری عقل رکھنے والے اور زیادہ کوتاہ فہم انسانوں نے پرورش وتکفل کی انھیں مذکورہ بالا تجلیات و مظاہر کو اصل منبع اور حقیقی سرچشمہ سمجھ کر انھیں معبود، اور قابل پرستش ٹھہرالیا۔ چنانچہ کواکب وسیارات آب و آتش اور شجر و حجر کی پرستش عقل وفہم کی اسی نارسائی اور حقیقت ناشناسی کا نتیجہ ہے۔

حق تعالےٰ نے قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ستارہ پرست اور مشرک قوم کا ذکر کیا ہے جو نجوم وکواکب کے تدبیری پہلوؤں اور تربیتی اثرات کو دیکھ کر چاند سورج اور ستاروں کو رب سمجھتی تھی۔ اور اسی قوم نے سورج کو ہذا ربی، ہذا اکبر کہا تھا، یعنی یہ ہے میرا رب یہ سب سے بڑا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہایت حکیمانہ انداز میں فرمایا کہ جب نمود صبح نے چاند اور ستاروں کو ماند اور بے نور بنا دیا اور رات کی تاریکی نے آفتاب کی روشنی پر پردہ ڈال دیا تو ثابت ہو گیا کہ چاند اور سورج اور ستارے اپنی ہزاروں تاثیرات وخصوصیات کے باوجود اپنے نور وکمال میں مستقل اور خانہ زاد نہیں ہیں اور جو اپنی تاثیر و تدبیر میں مستقل نہ ہو اس کو رب سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے دیوار کی دھوپ کو اصل سورج تصور کر لیا جائے۔ جس جس ذات خداوندی نے چاند، سورج اور ستاروں کو وجود دیا اور جس نے ان کو اپنی حقیقی ربوبیت و تدبیر کا مظہر بنایا اسی کی ربوبیت کامل بھی ہے اور مستقل بھی اور حقیقت میں وہی رب کہلانے کا مستحق بھی ہے۔

عقل ونظر کی اس گمراہی میں تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے

کہ اللہ کے ہمہ گیر نظام ربوبیت میں جن افراد یا ہاتھوں کو تدبیر و تربیت اور تکفلِ خداوندی کا ظاہری سبب اور واسطہ اور وسیلہ قرار دیا گیا تھا وہ بھی ربوبیت کی اس جھلک سے خود فریبی میں مبتلا ہو گئے اور مستقل رب ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ ربوبیت کے مسئلہ میں گمراہی کے دوسرے پہلو کا ذکر حق تعالیٰ نے خدائی اور رب کا دعویٰ کرنے والے نمرود کے اس مناظرہ میں کیا ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور نمرود کے مابین ربوبیت کے بارے میں ہوا تھا اس نے اپنے رب ہونے کا دعویٰ کیا صرف اس نخوت و غرور میں کہ وہ تخت و تاج کا مالک اور بڑی سلطنت کا بادشاہ تھا جیسا کہ قرآن کریم نے ظاہر فرمایا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ	یعنی کیا آپ نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے حضرت ابراہیمؑ سے ان کے رب کے بارے میں مناظرہ کیا تھا اس وجہ سے کہ اس کو اللہ نے سلطنت دی تھی

یا مصر کے اس فرعون کا ذکر فرمایا جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں تھا۔ اور اس نے

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى	میں تمہارا بڑا رب ہوں

کے الفاظ سے اپنے رب ہونے کا دعویٰ کیا۔ حالانکہ تدبیر و تربیت کے اس لامتناہی سلسلہ پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اللہ کے سوا ہر ایک کی تربیت اور پرورش یا کسی فرد اور ذات سے متعلق ہے یا مخصوص دائرہ اور حلقہ سے پھر زمین سے متعلق ہے یا آسمان سے۔ ماضی و حال سے متعلق ہے یا مستقبل سے۔

چنانچہ مالی اور باغبان کی تربیت اپنے چمن کی چار دیواری تک محدود ہے ماں باپ کی تربیت چند افراد اور مخصوص اشخاص کی حد سے متجاوز نہیں ہے۔ بادشاہ وامیر اپنی قلمرو اور صرف دائرہ سلطنت میں مربی کا درجہ رکھتا ہے اور آسمان و زمین کی اس وسیع کائنات میں دائرہ سلطنت کو وہ نسبت حاصل ہے جو ایک قطرہ کو سمندر سے ہے۔ انواع و اقسام کی مذکورہ بالا تربیتوں اور تدبیروں میں سے کوئی قسم بھی نہ دائرہ عمل کے اعتبار سے محیط ہمہ گیر اور کامل ہے اور نہ اپنی ذات اور وجود کے اعتبار سے خانہ زاد اور مستقل ہے۔ پس ربوبیت کے لئے ایک طرف یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زمین و آسمان کے ہر عالم ہر نوع۔ اور ہر مخلوق کو حاوی ہو اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو۔ اور دوسری طرف وہ تدبیر و تربیت ذاتی اور مستقل ہو۔ اسی معیار سے مالی کی ماں باپ کی یا بادشاہ و امیر کی حتی کہ آفتاب و ماہتاب کی تربیت و پرورش عام ہے اور نہ مستقل۔ کیونکہ مستقل تربیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خود اپنی ذات سے مؤثر ہو اور اسکی تاثیر کسی کا فیض اور عطیہ نہ ہو۔ پس جامع، کامل اور مستقل تربیت صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے، اسی لئے اس کے سوا نہ کسی کو رب کہنا روا ہو سکتا ہے اور نہ کسی کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اپنے متعلق رب ہونے کا دعوی کر سکے۔

اللہ کے وصفی ناموں میں سے کچھ نام ایسے ہیں جن کے معنی حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی جہت تک محدود ہیں یعنی ان کا مفہوم سمجھنے میں کسی دوسری مخلوق اور ماسوی اللہ کا مطلق دخل اور واسطہ نہیں ہے جیسے حی۔ قیوم اور قدیم وغیرہ۔ اور کچھ

نام ایسے بھی ہیں جن کے معنی اور مفہوم سمجھنے میں ماسوا اللہ اور دوسری مخلوقات کا تعلق اور وابستگی بھی ہے اور خالق و مخلوق کی دونوں جہتوں کے بغیر نہ مفہوم مکمل ہوتا ہے اور نہ سمجھ میں آسکتا ہے جیسے غفور اور رزاق کہ مغفور یعنی گنہگار اور گناہ کے بغیر یا مرزوق یعنی محتاج اور خود رزق کے بغیر دونوں کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اللہ کے اسماء حسنیٰ میں بعضے نام لازم ہیں اور بعضے متعدی حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ زیر بحث اللہ کا وصفی نام یعنی (رب) بھی انہیں متعدی ناموں میں سے ایک ہے جس کا مفہوم اور اس کا مصداق دیگر متعلقات اور دوسری جہت کو ملحوظ رکھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا، چنانچہ (رب) کے مفہوم میں ایک جہت ربوبیت باری اور تکفل کی ہے اور دوسری جہت مربوب یعنی ماسوا اللہ کی حاجتمندی اور غیر اللہ کی نیازمندی سے متعلق ہے۔ ان دونوں جہتوں کو ملانے سے ماحصل اور خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ماسوی اللہ اپنے وجود میں تربیت و بقا میں اور معیار کمال تک پہنچنے میں لمحہ بہ لمحہ گوناگوں حاجتوں اور ضرورتوں کا پیکر اور سراپا احتیاج ہے اور حق تعالےٰ ماسوا اللہ کے احوال اور اس کے تقاضوں کے عین مطابق لمحہ بہ لمحہ اور ہر آن حاجت روائی، تکفل اور حد کمال تک پہنچانے میں لگے ہوئے ہیں۔ شکم مادر میں قطرۂ آب کو بستہ خون کی شکل دینا اور پھر اسے گوشت کے بے جان لوتھڑے کی صورت میں تبدیل کر کے اس میں ہڈیاں، آنکھ، ناک، کان اور زبان جیسے اعضاء کو پیدا کر کے اس تاریک کوٹھڑی میں اس کو رزق پہونچانا پھر حواس و کیفیات، ذوق و بصیرت اور

عقلی و فکری جوہر سے آراستہ کر کے کمالات خداوندی کے مظہر اتم کی منزل کمال تک پہنچاتا اسی شان ربوبیت کا نتیجہ اور اسی پرورش کا ادنےٰ سا کرشمہ ہے۔ پس ماسوا اللہ مربوب ہے اور اللہ اس کا رب، کائنات محتاج ہے اور اللہ اس کا حاجت روا، غیر اللہ سائل ہے اور اللہ اس کا معطی۔ اللہ اور ماسوا اللہ کے درمیان حاجتمندی اور حاجت روائی کا یہ بنیادی اور نمایاں فرق اور تکفل و نیازمندی کا یہ واضح امتیاز اس قدر بدیہی اور روشن ہے کہ اس میں کسی فریب خوردگی اور اشتباہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا، مگر احتیاج انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اس لئے ماسوی اللہ میں جب کبھی حاجت روائی کا پرتو اور عکس اسے دکھائی دیتا ہے تو عام طور پر اور بڑی کثرت سے یہ پرتو اور عکس اللہ کی حقیقی شان ربوبیت کے لئے حجاب بن جاتا ہے اور بندہ کی کوتاہ بیں نگاہوں میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی شوخ زبان شاعر نے اس اشتباہ کی کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

یاروبھی تم جلاؤ بھی تم تم کو کیا کہوں
تمکو خدا کہوں کہ خدا کو خدا کہوں۔

اسی عام انسانی لغزش اور اشتباہ کی بنا پر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اپنے زمانے میں مسئلہ ربوبیت اور اس کے تمام گوشوں کی اس اہتمام کے ساتھ وضاحت کی کہ ربوبیت کے چہرہ سے تمام حجابات اٹھ گئے۔ فریب نگاہ کے تمام پردے چاک ہو گئے اور نکھری ہوئی شان ربوبیت خود اپنے منہ سے بول اٹھی۔

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ
نہیں ہے اس جیسی کوئی چیز ۔

آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

رب العالمین کی تشریح میں لفظ "رب" کے بعد دوسرا لفظ عالمین ہے اور یہ "عالَم"، (یعنی لام کے زبر کے ساتھ کی) جمع ہے محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ علم سے بنا ہے اور عالم سے مراد وہ انسانی مخلوق ہے جو علوم الٰہیہ کی حامل بلکہ صفت علم الٰہی کی مظہر اتم ہے۔ کیونکہ خلق و جود میں جس طرح انسان اشرف و اعلیٰ ہے اسی طرح ربوبیت خداوندی کا اعلیٰ شاہکار بھی، پوری کائنات میں انسان سے بڑھ کر کوئی نہیں کیونکہ تربیت کی دو قسمیں ہیں ایک تربیت خلقیہ جو نشو و نما اور احساس و شعور سے متعلق ہے ۔ دوسری تربیت شرعیہ، جو علم و نظر اور ہدایت وحی کے روحانی فیض سے متعلق ہے ، انسان کے سوا باقی مخلوقات سے صرف ایک قسم کی تربیت کا تعلق ہے اور انسان سے دونوں قسم کی تربیتیں وابستہ ہیں ۔ خلقیہ بھی اور شرعیہ بھی ۔ اور جس طرح تربیت خلقیہ میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ اسی طرح تشریعی یعنی حلال و حرام کے احکام تجویز کرنے کا حق بھی سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں ہے ۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔
اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ
یاد رکھو کہ تخلیق بھی اسی کا کام ہے اور
احکام دینا بھی اسی کا حق ہے ۔

کہ یاد رکھو تخلیق بھی اسی کا کام ہے اور حکم احکام دینا بھی اسی کا حق ہے ۔

اس رائے کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہوا کہ کل موجودات میں

ربوبیت کا مظہر اتم صرف وہی مخلوق ہوسکتی ہے جس میں تخلیقی و تشریعی دونوں قسم کی تربیتیں موجود ہوں اور وہ انسانی مخلوق ہے کہ پیدائش میں

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ تحقیق ہم نے انسان کو بہت اچھی ترکیب میں پیدا کیا ہے۔

کا مصداق ہے اور علمی واخلاقی اعتبار سے "خلیفۃ اللہ فی الارض" ہے۔ لہٰذا عالمین سے بھی علم و معرفت والی، مخلوق یعنی انسان ہی مراد ہے۔ اور قرآن کریم میں بعض مقامات پر عالمین سے انسان کے سوا کوئی دوسری مخلوق مراد بھی نہیں لی جاسکتی۔ جیسے فرمایا۔

لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا تاکہ لوگوں کو عذاب سے ڈرانیوالے ہوں۔

یعنی تاکہ عالمین کے لئے مبلغ اور عذاب سے ڈرانیوالے ہوں ظاہر ہے انذار اور تبلیغ جن وانسان کے سوا کسی مخلوق سے متعلق نہیں ہوسکتی۔

دوسرے علماء محققین کی رائے یہ ہے کہ لفظ "عالم" علم سے نہیں بلکہ علامت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نشانی، اور عالم وہ چیز ہے جس سے کوئی دوسری چیز جانی جائے۔ یعنی جو جاننے اور پہچاننے میں نشانی کا کام دے۔ چونکہ کائنات اور کائنات کا ہر ہر ذرہ اللہ کے وجود پر ایک واضح نشانی اور علامت ہے۔ اس لئے کل کائنات کو "عالم" کہا جاتا ہے اور موجودات کے الگ الگ دائروں اور حلقوں کے اعتبار سے عالمین بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے عالم جمادات، عالم حیوانات، عالم نباتات، عالم اجسام اور عالم ارواح۔ پھر عالم شہادت اور عالم غیب وغیرہ۔

حاصل یہ کہ مخلوقِ انسانی کا عالمِ اصغر مراد ہو یا کل موجودات کا عالمِ اکبر۔ دونوں عالموں کا ہر ہر جزو اللہ کے وجود اور اس کی ربوبیت پر شاہد اور گواہ ہے سہ

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

خداوند قدوس کی بتلائی ہوئی قدیمانہ درخواست اور آسمانی مناجات کے سرعنوان لکھے ہوئے شاہی القاب میں سے تیسرا نمبر اور چوتھا لقب "الرحمٰن الرحیم" ہے اور سلسلۂ القاب کی اس ترتیب میں بھی یہ حکیمانہ اور بلیغ نکتہ پوشیدہ ہے کہ خلق و وجود کے بعد جس طرح کامل تربیت لازمی و ضروری ہے۔ اسی طرح حدِ کمال تک پہونچنے کے بعد بقاء کمال اور کمال نوازی کی بے پایاں شفقت و مہربانی کی ضرورت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے اسی مہربانی اور شفقت کا اظہار "الرحمٰن الرحیم" میں کیا جا رہا ہے۔

"رحمٰن" اور "رحیم" یہ دونوں لفظ حق تعالےٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہیں مگر دونوں کے درجے اور مرتبے سمجھنے کے لئے یہ بنیادی بات پہلے ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ معنی و مفہوم کی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے اللہ کے ناموں میں بھی عظمت و فضیلت کے مختلف درجے اور مرتبے ہیں۔ جس نام کو سب سے زیادہ عظمت و برتری حاصل ہے وہ حق تعالےٰ کا اسم ذات لفظ "اللہ" ہے اسی لئے اس کو اسم اعظم بھی کہتے ہیں۔ اور اسم اعظم کے بعد عظمت و بزرگی کا دوسرا درجہ اور مرتبہ لفظ "رحمٰن" کو حاصل ہے جس کی تائید میں قرآن کریم کی یہ آیت بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ — آپ لوگوں کو بتلا دیجئے کہ اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔

حق تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے دونوں ناموں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے اور اس ترتیب سے کہ پہلے اللہ اور اس کے بعد رحمٰن۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسانوں کے ناموں میں اللہ کو دو نام سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ ایک عبداللہ دوسرا عبدالرحمٰن۔

حدیث نبوی میں بھی اللہ کے پسندیدہ ناموں کا اظہار اسی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ جو حق تعالیٰ نے قرآن کریم کی آیت میں بیان فرمائی کہ پہلے اللہ بعد میں رحمٰن۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کا نام بھی اللہ کا یہی پسندیدہ نام عبداللہ تھا اور حضورؐ نے اپنے صاحبزادے کا نام بھی عبداللہ رکھا تھا جن کا لقب طیبؑ و طاہر بھی ہے۔

حضورؐ کے مذکورہ بالا ارشادِ گرامی سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ ہمارے ناموں میں بھی اللہ کو کچھ نام بہت زیادہ محبوب ہیں اور کچھ اس سے کم۔ اور بعضے نام ناپسندیدہ اور مبغوض بھی ہیں۔ پس عبداللہ اور عبدالرحمٰن کے بعد وہ تمام نام جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی یا دیگر حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مبارک ناموں سے متعلق ہیں یا جن میں اللہ کے حضور ہماری عبدیت، نیازمندی اور بے بضاعتی کا اظہار ہو۔ وہ سب اللہ کی نظروں میں پسندیدہ اور موجب برکت ہیں۔ باقی وہ نام جن میں ماسوا اللہ اور غیر اللہ کے سامنے عبدیت و احتیاج کا مشرکانہ اظہار ہو یا بے جوڑ بے معنی اور مہمل نام ہوں سو نہ دینِ توحید میں ان کی گنجائش ہے اور نہ اللہ کی نظروں میں وہ مقبول و پسندیدہ ہو سکتے ہیں۔

اسلامی نام کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا تو اسوقت ان کا نام عبدالکعبہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ اسلامی نام عبداللہ تجویز فرمایا۔

بہرحال اسم اعظم کے بعد اللہ کے ناموں میں دوسرا درجہ اور مرتبہ حق تعالےٰ کے صفتی نام "رحمٰن" کا ہے۔

حق تعالےٰ کے اسمارِ حسنیٰ میں بعضے نام ایسے ہیں کہ جنہیں لفظی اور اسمی اشتراک کی حد تک غیر اللہ کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے دونوں کی حقیقت بالکل الگ الگ اور مختلف ہوتی ہے۔ جیسے لفظ "رؤف" اور "رحیم" کہ قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ کے لئے بھی آیا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ	یقیناً تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں کہ جنپر تمہاری مشقتیں گراں ہیں۔ تمہاری بھلائی کے خواہشمند ہیں۔ ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق و مہربان ہیں

اور بعضے نام ایسے ہیں کہ ان کے خصوصی مفہوم کی نزاکت اور اس کی معنوی وسعت و عظمت لفظی اشتراک کو بھی گوارا نہیں کرتی اور مصداق کے تفاوت کو ملحوظ رکھنے کے باوجود ان کا استعمال ہی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں جیسے لفظ "اللہ"، یا لفظ "رحمٰن" اور لفظ "رب" وغیرہ۔

با سایہ ترا نمی پسندم عشق است و ہزار بدگمانی

رحمٰن اور رحیم دونوں لفظ رحمت سے بنے ہیں۔ اور رحمت کے

معنی ائمہ لغت نے یہ لکھے ہیں کہ "کسی کی طرف سے دل میں ایسی رقت اور نرمی پیدا ہونا جو بخشش و عنایت پر آمادہ کردے"
قاضی بیضاوی ؒ اور دوسرے مشہور مفسرین نے عام طور پر لکھا ہے کہ رحمت کا لفظ جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو اس وقت یہ لغوی اور حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں بلکہ مجازاً رحمت کا نتیجہ اور ثمرہ مراد ہوتا ہے۔ پس رقت قلب اور دل کی نرمی کا نتیجہ بخشش اور احسان ہے جو دل کی نرمی سے وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا رحمٰن اور رحیم کے معنی اور مفہوم کی تعبیر منعم محسن اور معطی جیسے الفاظ سے کی جا سکتی ہے۔
اور وجہ اس کی یہ ظاہر کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ جسم اور جسم کے تمام اعضاء سے منزہ اور پاک ہے۔ لہٰذا دل کی نرمی کا سوال اسی جگہ پیدا ہو سکتا ہے جہاں دل ہو۔ اور جہاں جسم و بدن ہی موجود نہ ہو۔ وہاں نہ دل ہے اور نہ دل کی کوئی کیفیت۔

ع جامہ ندارم دامن از کجا آرم

گویا مخلوق کے لئے لفظ رحمت کا استعمال حقیقت ہے اور خالق کے لئے مجاز۔
حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا کہ تاویل کی ستم ظریفی دیکھئے کہ رحمت و رافت کا حقیقی سرچشمہ دراصل اللہ کی ذات ہے۔ اسی لئے اپنے بیکران سمندر رحمت سے ایک قطرہ ساری کائنات پر کیا چھڑکا کہ مخلوقات کے سینوں میں اور ماؤں کے دلوں میں رحمت و شفقت لہریں مارنے لگی ؎

یہ موج دریا یہ ریگ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

پس حقیقی رحمت و رافت اللہ میں ہے اور مخلوقات میں جو جھلک پائی جاتی ہے اس کو مجازاً رحمت کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقت کا پرتو اور عکس ہے۔

اہل تاویل نے کمال کر دیا کہ ذات خداوندی کی حقیقی رحمت کو مجاز اور مخلوقات کی مجازی رحمت کو حقیقت بنا دیا ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

پس صاحب دل اور اہل حقیقت علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ رحمت کا لفظ اللہ کی شان میں حقیقت ہی حقیقت ہے مجاز نہیں۔ اور جس طرح اس کی حیات جسم و بدن کی محتاج نہیں اور اس کا دیکھنا اور سننا آنکھ اور کان کا محتاج نہیں اسی طرح اس کی شان رحمت و رافت بھی قلب اور دل کی محتاج نہیں باقی ان تمام صفات الٰہیہ کی کنہ اور حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میدان میں عقل و فکر کی نارسائی اور درماندگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

بہرحال رحمٰن و رحیم میں رحمت کے حقیقی معنی مراد ہوں یا نتیجہ رحمت۔ یعنی انعام و احسان دونوں صورتوں میں یہ امر اپنی جگہ تشریح طلب ہے کہ آیا یہ دونوں لفظ مترادف و ہم معنی ہیں یا دونوں کے مفہوم مختلف اور الگ الگ ہیں۔ بعض مفسرین

کی یہ رائے ہے کہ یہ دونوں لفظ اسم مبالغہ ہیں اور دونوں کے معنیٰ و مفہوم میں کوئی تفاوت اور فرق نہیں ہے اور ایک ہی معنیٰ و مفہوم کے دو لفظوں کی تکرار کا مقصد تاکید ہے یعنی وہ بہت زیادہ مہربان ہے اور پھر سنو وہ واقعی بہت زیادہ مہربان ہے، تفسیر المنار کے جامع و مؤلف علامہ سید رشید رضا نے مفتی محمد عبدہ کی اس پر جرح نقل کی ہے کہ اللہ کے کلام کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ ایسے دو ہم معنیٰ مکرر الفاظ جو بعینہ ایک نہ ہوں بلکہ حروف کی ترتیب میں اور وزن و صورت میں مختلف اور الگ الگ ہوں۔ زیادتی مفہوم اور مزید معنیٰ کے بغیر صرف ایک دوسرے کی تاکید کے لئے آئے ہوں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربی زبان میں بھی علم بلاغت کے اصول کے مطابق تاکید ایک اہم مقصد ہے اور اس کے طریقے اور اسلوب حتیٰ کہ اس کے حروف بھی مقرر ہیں۔ لیکن دو تین مترادف الفاظ کا استعمال کرنا بغیر زیادتی مفہوم کے کلام الٰہی کی معجزانہ شان کے خلاف ہے۔ لہذا معنیٰ و مفہوم اور افادیت کے لحاظ سے یہ دونوں لفظ الگ الگ اور جدا ہیں۔

اس تحقیق کی بنا پر لفظ رحمٰن، غَضْبَان و عَطْشَان کی طرح اسم مبالغہ ہے اور لفظ رحیم، علیم و حکیم کی طرح اسم صفت ہے۔ اس ظاہری و لفظی فرق کے علاوہ معنوی اعتبار سے دونوں میں باہم یہ فرق بھی ہے کہ "مبالغہ" کے مفہوم میں دو چیزیں لازمی ہیں ایک فعل کا صدور دوسرے فعل کی زیادتی، چنانچہ غضبان کا مفہوم یہ ہے کہ اس وقت غصہ کا ظہور بھی ہو رہا ہے اور وہ غضب اپنی جگہ ہے بھی زیادہ۔ اور اسم صفت میں صرف کسی صفت کا

لزوم اور جوہر کی موجودگی بتلائی جاتی ہے، صدور فعل سے اس میں متعلق کوئی بحث نہیں ہوتی، جیسے جمیل و کریم کہ صفت جمال و کرم ان میں موجود بھی ہے اور لازمی بھی۔ لہٰذا رحمٰن و رحیم کا مفہوم اور مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ اور مسلسل رحم فرما رہے ہیں اور وہ اپنی ذات سے بھی رحیم ہیں۔

مفہوم و معنی کے اعتبار سے دونوں لفظوں میں ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ علم لغت کا ایک اصول ہے کہ حروف کے زیادہ ہونے سے ... معنی میں بھی اضافہ اور زیادتی ہوتی ہے۔ چنانچہ رحمٰن میں پانچ حروف ہیں اور رحیم میں چار اس بناء پر لفظ رحمٰن کے معنی میں لفظ رحیم کے معنی سے زیادہ مبالغہ اور اضافہ ہونا لازمی اور ضروری ہے اسی وجہ سے مفسرین نے رحمٰن میں زیادتی معنی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے کر دیا اور رحیم کا تعلق صرف آخرت سے، گویا رحمٰن وہ ہے جس کی رحمت کا ظہور کائنات اور انسان کی رحیمانہ تخلیق سے قیام قیامت تک برابر جاری رہے گا۔ اور عالم آخرت کی تمام نعمتیں اور راحتیں بھی اسی کی رحمت کا فیض اور شان رحمانی کا اثر ہوگا۔ اور رحیم وہ ہے جس کی صفت رحمت کا ظہور صرف عالم آخرۃ یعنی جزا و سزا کے موقع پر ہوگا۔ خواہ مغفرت و بخشش کی شکل میں ہو یا تخفیف عذاب کی صورت میں۔

بعض علماء نے رحمٰن میں زیادتی معنی کا لحاظ اس طرح فرمایا ہے کہ رحمٰن کی رحمت کا محل کافر بھی ہے اور مؤمن بھی، اور رحیم کی شفقت کا تعلق صرف اہل ایمان کے ساتھ ہے۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے "یا رحمٰن الدنیا و رحیم الآخرۃ" حاصل یہ کہ رحمٰن کے

معنی میں بہ نسبت رحیم کے زیادتی اور عموم ہے خواہ دنیا و آخرۃ کے دونوں عالم کے اعتبار سے ہو اور یا مؤمن و کافر کے دونوں گروہوں اور جماعتوں کے اعتبار سے۔

لفظ رحمٰن کے مفہوم کی وسعت اور معنی کے عموم کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں رحمت خداوندی کی وسعت، ہمہ گیری اور عموم کا بیان مقصود ہے۔ وہاں لفظ رحمٰن ہی استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى — رحمٰن عرش پر قائم ہو گیا

عرش کے معنی ہیں تخت۔ اور عرش الٰہی زمین و آسمان اور کل موجودات پر حاوی اور محیط ہے۔ موجودات عالم میں عرش کا درجہ اور مقام ایسا ہی مرکزی ہے جیسے کسی ملک و سلطنت میں بادشاہ کا شاہی تخت ہوتا ہے۔ اور تخت شاہی حکومت و سلطنت اور اقتدار کا نشان ہے۔ کیونکہ تخت نشینی سے شاہی احکام کا نفاذ شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے استوی علی العرش سے مراد بھی بطور تمثیل کے حق تعالیٰ کے حاکمانہ اقتدار اور اس کی سلطنت کا اظہار ہے اور اس موقع پر لفظ رحمٰن کے لانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ جس طرح اس کا اقتدار کل موجودات پر حاوی و محیط ہے۔ اسی طرح حق تعالےٰ کی رحمت و شفقت بھی موجودات عالم کے لئے عام و تام ہے۔ رحمت باری کی اس وسعت اور عموم کا اظہار دوسری جگہ حق تعالیٰ نے واضح اور صریح الفاظ میں اس طرح فرمایا۔

وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ — یعنی میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے،

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالےٰ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ زمین و آسمان، عرش و کرسی اور کل موجودات کو پیدا فرمانے کے بعد اللہ کے حکم سے "سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ" یعنی "میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے" کی عبارت لکھ کر عرش پر آویزاں کردی گئی۔ بعض شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ دنیا میں قرآن و حدیث کے ذریعے ہم کو جزا و سزا کے ضابطے اور بخشش و گرفت کے اصول بتلائے گئے ہیں۔ مگر ضابطے اور اصول سے بھی ورا اور بلند ایک درجہ مراحم خسروانہ کا ہے یعنی حاکم کا وہ امتیازی اور مشفقانہ برتاؤ جو کسی وقت اور کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے اس کے لئے اصول و ضابطے کی نہیں بلکہ محض اللہ کی خصوصی رحمت کی ضرورت ہے ؎

رحمتِ حق بہانہ مے جوید رحمتِ حق بہا نمی جوید

پس عرش پر لٹکی ہوئی رحمت الٰہی کی یہ عبارت درحقیقت مراحم خسروانہ کا ایک اعلان ہے۔ گویا جس طرح ضابطے اور اصول کی بناء پر حساب و کتاب لینا اور جزا و سزا دینا اسکے قبضہ و اختیار میں ہے اسی طرح مراحم خسروانہ کا خصوصی اختیار اور حق بھی خدا وند قدوس ہی کو حاصل ہے۔

امام ترمذی نے لفظ رحمٰن کے بارے میں ایک نہایت اہم اور سبق آموز حدیث قدسی نقل فرمائی ہے۔

قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَھَا اِسْمًا مِنْ اِسْمِیْ فَمَنْ وَصَلَھَا وَصَلْتُہٗ وَمَنْ قَطَعَھَا قَطَعْتُہٗ

یعنی حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ میں ہی رحمٰن ہوں میں نے ہی رحم کو پیدا کیا۔ اور میں نے ہی اپنے نام (رحمٰن) کو ماخذ بنا کر اس کا نام

رحم رکھا۔ پس جو اس سے رشتہ جوڑے گا میں اس سے اپنا تعلق رکھوں گا اور جو اس سے رشتہ توڑے گا تو میں اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔

عربی میں رحم (را کے زبر اور حا کے زیر کے ساتھ) کے اصل معنی ہیں شکم مادر میں بچہ کی جگہ، حضرت آدمؑ و حوا کی پیدائش کے بعد انسان کے وجود اور تخلیق کی جگہ یہی رحم ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ تمام انسانی قرابتوں، رشتہ داریوں اور روابط کی بنیاد اور جڑ دراصل ازدواجی تعلق ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ رحم مادر ہی تمام رشتہ داریوں کا حقیقی سرچشمہ ہے کیونکہ مرد و زن الگ الگ دو اجنبی شخصوں کے سوا کچھ نہ تھے ازدواجی تعلق نے مرد کو شوہر، عورت کو بیوی بنا دیا۔ دونوں کے ماں باپ بھائی بہن۔ مختلف ناموں سے رشتہ دار ہو گئے اولاد ہوئی تو خود ماں باپ بنے۔ بھائی۔ بہن۔ ماموں چچا، خالہ اور پھوپھی ہو گئے وغیرہ وغیرہ اسی مناسبت اور تعلق سے رحم کے معنی قرابت داری اور رشتہ داری کے بھی آنے لگے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ نکاح میں قرآن کریم کی جو آیتیں تلاوت فرمائی ہیں ان میں سے پہلی آیت میں ازدواج اور قرابت داریوں کا ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ	اور اس ایک جان سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پھیلا دیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کی قسمیں کھاتے ہو اور ارحام یعنی رشتہ داریوں کا بھی لحاظ کرو۔

مذکورہ بالا حدیث قدسی میں نہایت مؤثر اور بلیغ انداز میں
انسانی قرابت داریوں کے تحفظ اور تعلقات کے قائم رکھنے کی طرف
توجہ دلائی گئی ہے کہ رحم کا ماخذ اور اصل اللہ کا مقدس نام رحمان
ہے اور اللہ نے اپنے نام کا جزو اور حصہ بنا کر رحم کے ساتھ اپنے غیر
معمولی اور گہرے تعلق کا اظہار فرما دیا کہ صلہ رحمی کا مطلب صرف
انسان کے ساتھ ہی رشتہ جوڑنا نہیں ہے بلکہ وہ حقیقت میں
رحمن کے ساتھ بھی رشتہ جوڑنا ہے اور قطع رحمی کرنے والا رحمن سے
بھی اپنا رشتہ اور تعلق توڑ لیتا ہے۔
اس حدیث قدسی سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اسلام صرف سجدہ
ریزی، تسبیح اور سجادہ و دلق ہی کا نام نہیں ہے بلکہ انسانی برتاؤ
حسن سلوک اور صلہ رحمی کا درجہ بھی اسلام میں اتنا اونچا اور بلند
ہے کہ تمثیل کے طور پر حق تعالے نے خود اپنی ذات کو بندوں کے مقام
پر ظاہر فرما کر انسان کے دل میں انسان کا احترام پیدا فرما
رہے ہیں ؎

اصل تہذیب احترام آدم است

گویا جس نے رحم یعنی انسانی تعلقات اور رشتہ داری کے
روابط کا احترام کیا اس نے رحمن کا احترام کیا اور جس نے انسانی رشتہ
کی ہتک کی بے توقیری کی اس نے رحمن کی بھی بے توقیری اور توہین
کی۔ انسان کو حقیر سمجھنے والے انسان اس انداز بیان سے یہ نکتہ
ضرور ذہن نشین کر لیں کہ انسان اپنی جگہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو
مگر اس کی نسبت بہت بڑی اور بہر صورت قابل احترام ہے ؎
گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم
حاصل یہ کہ رحیم کی بہ نسبت رحمن کے معنی بھی زیادہ ہیں

اور دوسرے صفاتی ناموں کے اعتبار سے رحمٰن کی عظمت بھی زیادہ ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ نے لکھا ہے کہ ایک حاجتمند سائل کسی اونچے درجے کے رئیس کے پاس گیا اور کہا کہ میں ایک نہایت معمولی اور ادنیٰ سا کام لے کر آیا ہوں۔ اس رئیس اعظم نے جواب دیا کہ اگر کام معمولی اور ادنیٰ سا ہے تو اسے ہر معمولی اور ادنیٰ آدمی بھی انجام دے سکتا ہے، میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ گویا مہمات امور صرف اعظم ہی سے متعلق ہوتے ہیں اور چھوٹے و معمولی کام غیر اعظم سے بھی۔

پس رحمٰن و رحیم دونوں ناموں سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اہم سے اہم مقاصد بھی ہوں تب بھی اللہ کی رحمت ہی سے مانگو۔ کیونکہ وہ رحمٰن ہے اس سے اونچی کسی کی شان اور کسی کی عظمت نہیں۔ اور اگر چھوٹی سے چھوٹی حاجت بھی ہو تب بھی اللہ ہی سے مانگو کہ وہ رحیم بھی ہے۔ یعنی معمولی اور چھوٹی چیزوں کے دینے میں بھی اسے کوئی عار اور شرم نہیں ہے۔ اس کی نظر میں چھوٹی بڑی حاجتیں سب یکساں اور برابر ہیں۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ — جزا کے دن کا مالک ہے۔

حق تعالیٰ کی تبلائی ہوئی خود بانہ عرضی کے شاہانہ القاب میں سے یہ پانچواں اور آخری لقب ہے۔ سلسلۂ القاب کی حکیمانہ ترتیب میں اس آخری لقب کا درجہ کیا ہے اس کا اندازہ اس لقب کی تشریح اور اس کے مفہوم سے ہو سکے گا۔

مالک یوم الدین میں تین لفظ ہیں۔ ایک مالک دوسرا یوم اور تیسرا الدین۔ مالک کی دوسری مستند روایت مَلِک بھی ہے

یعنی صحیح اور مستند طریقے سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک یوم الدین پڑھا۔ اور اسی صحت و سند کے ساتھ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھا ہے دونوں روایتوں کے اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظ مالک کی کتابت اور لکھائی میں عربی کا عام رسم الخط اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ میم، لام اور کاف ملا کر اور میم پر چھوٹا سا الف بنا کر لکھا گیا ہے[۱]۔ اور سورۂ فاتحہ میں لفظ ملک کا یہ رسم الخط قرآنی رسم الخط کہلاتا ہے جو عربی سے کسی قدر مختلف اور الگ ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کے سلسلے میں جو نہایت حکیمانہ اور غیر معمولی عجیب و غریب طریقے اللہ کی طرف سے الہام کئے گئے ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم طریقہ قرآن کریم کا رسم الخط بھی ہے جس میں فرق روایت شان نزول اور دوسری نہایت دقیق حکمتوں اور باریک نکتوں کی خاص رعایت رکھی گئی ہے۔ قرآنی رسم الخط کی حفاظت درحقیقت قرآن ہی کی حفاظت ہے۔ اسی لئے اس رسم الخط میں قیامت تک کسی کو کسی قسم کا بھی رد و بدل کرنے کا حق اور اختیار نہیں ہے۔ پس قرآنی رسم الخط کے مطابق ملک کی لکھائی میں مالک ملک کے دونوں تلفظ کی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے۔

مفسرین میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ صورت اور تلفظ میں تفاوت اور فرق کے باوجود یہ دونوں لفظ مفہوم کے اعتبار سے مترادف اور ہم معنی ہیں یعنی جو معنی مالک کے ہیں بعینہ وہ ہی معنی ملک کے بھی ہیں۔ دونوں میں مطلق کوئی فرق نہیں۔ گویا کہ ایک ہی لفظ کے دو مختلف تلفظ اور مختلف طریق ادا ہیں، کیونکہ عربی میں فَاعِلٌ اور فَعِلٌ کے وزن کے مطابق الفاظ عام طور پر

[۱] مٰلِكِ ۱۲

ایک ہی معنی میں آتے ہیں۔ اور اہلِ لغت نے اس فرق کو تلفظ کا فرق قرار دیا ہے جیسے قارۃٌ اور قرۃٌ وغیرہ لیکن محققین علماء اور جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے یہ دونوں لفظ جس طرح صورۃ و تلفظ میں الگ الگ ہیں اسی طرح دونوں کی حقیقت، دونوں کے معنی اور مفہوم بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور جدا ہیں۔ چنانچہ مالک کا ماخذ اور اس کی اصل مِلک بمعنی ذاتی ملکیت ہے اور مَلِکْ کی اصل مُلک ہے جس کے معنی حکومت و بادشاہت اور حاکمانہ اقتدار کے ہیں اپنے اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے یہ دونوں لفظ حق تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ میں دو الگ الگ نام شمار کیے گئے ہیں۔ اور قرآن کریم میں بھی یہ دونوں اسماء الٰہی دو الگ الگ معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ — یعنی آپ کہئے کہ اے اللہ! یعنی سلطنتوں کے مالک

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا — یعنی جزا و سزا کا ظہور اس دن ہوگا جس دن کوئی شخص کسی کے حق میں کسی چیز کا مالک نہ ہوگا۔

اسی طرح لفظ مَلِکْ بھی حق تعالےٰ کے لئے قرآن کریم میں متعدد جگہ آیا ہے۔

سورۂ حشر میں ہے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ — یعنی سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں وہ کل جہان کا بادشاہ ہے ہر برائی سے پاک ہے۔

دوسری جگہ سورۃ الناس میں ہے:۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ — یعنی آپ کہئے کہ میں لوگوں کے رب اور
مَلِكِ النَّاسِ — لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

بہرحال یہ دونوں لفظ خواہ مترادف وہم معنی ہوں یا مختلف اور الگ الگ اللہ کے دو صفاتی نام ہیں۔

رہی یہ بات کہ یہاں یعنی خداوند قدوس کی بارگاہ میں پیش کی جانے والی اس فدویانہ عرضی میں دونوں میں سے کونسا لفظ زیادہ بلیغ اور موقع کے مناسب ہے۔

سو اس سلسلہ میں بعض مفسرین نے مَلِك کو پسند کیا کہ اس سے اللہ کی شان عدل کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ حاکم و بادشاہ کا اصل کام یہ ہے کہ وہ مجرم و باغی کو سزا دے۔ اور وفادار خدام کو ان کی خدمات کا صلہ مرحمت فرما دے۔ اور اللہ کے اوصاف میں عدل و انصاف کا وصف نہایت اہم اور نمایاں ہے۔

لفظ مَلِك کو افضل و بہتر قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ حکومت کے اقتدار کا اثر پوری قلمرو اور قلمرو کی ہر رعیت پر ہوتا ہے اور ملکیت کا اثر چند گنی چنی چیزوں تک محدود رہتا ہے وغیرہ وغیرہ

مفسرین کے دوسرے طبقے نے لفظ مالک کو اس موقع کے لئے زیادہ مناسب اور بلیغ قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ عرضی ایک محتاج اور نیازمند کی طرف سے کچھ حاصل کرنے اور مانگنے کے لئے پیش کی جا رہی ہے اور لفظ مالک سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ

بخشش وعطا مالک کے لئے آسان ہے اور سلطان کیلئے مشکل کیونکہ مالک اپنی ملکیت میں خود مختار ہے۔ چاہے فروخت کردے اور چاہے ہبہ کردے۔ بخلاف حاکم و بادشاہ کے کہ اس کی ملکیت ذاتی نہیں بلکہ محض سرکاری ہے جسے نہ وہ فروخت کرسکتا ہے اور نہ ذاتی طور پر کسی کو دے سکتا ہے۔ پھر مالک کو اپنے مملوک پر تصرف کا جو حق حاصل ہے وہ حق بادشاہ کو اپنی رعیت پر حاصل نہیں۔ مالک اپنے غلام سے خدمت لے سکتا ہے بادشاہ اپنی رعیت سے خدمت نہیں لے سکتا۔ حاکم و بادشاہ سے ملک کے عمومی انتظام اور انصاف سے زیادہ کسی چیز کی توقع نہیں ہوتی لیکن مالک مملوک کی چھوٹی بڑی ضرورت کا کفیل ہوتا ہے گویا وصفی نام مالک سے اللہ نے یہ اعلان کردیا کہ میں تمہارا مالک ہوں اور تم میرے مملوک تمہاری خوراک، تمہاری پوشاک اور تمہاری رہائش ہر چیز میرے ذمہ ہے۔ یہاں تک کہ تمہارا ثواب اور آخرۃ کی جنت یہ بھی اسی طرح میرے ذمہ ہے جس طرح مملوک کی کل حاجتیں مالک کے ذمہ ہوتی ہیں۔

یوم کے معنی ہیں دن اور دن بھی چونکہ زمانے اور وقت کا حصہ ہے اس لئے کبھی کبھی لفظ یوم سے محض وقت اور زمانے کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے لفظ یوم جنگ اور جہاد کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا جیسے یوم حنین، یوم احد، یعنی جنگ حنین اور جنگ احد وغیرہ۔

لفظ یوم جس کا ترجمہ ابھی ابھی دن کیا گیا ہے۔ اس کی ابتداء طلوع آفتاب سے ہوتی ہے اور غروب آفتاب پر دن کی مدت ختم ہوجاتی ہے۔ اس مدت کو عرف عام میں یوم کہا جاتا ہے

لیکن شریعت کے احکام اور اصطلاح میں لفظ یوم صبح صادق سے شروع ہو کر غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے۔ پس ایک یوم یوم شرعی ہے۔ اور دوسرا یوم عرفی۔ یہاں جس یوم کا ذکر ہے وہ یوم جزا اور یوم آخرۃ ہے۔ جو قیام قیامت سے حساب وکتاب کے اختتام تک کی مدت کو کہا جاتا ہے جس کی مدت قرآن کریم نے دنیاوی ایک ہزار سال کے برابر بتلائی ہے۔

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ

اور ایک دن تیرے رب کے یہاں ہزار برس کی برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو۔

"الدین" عربی میں دین کے اصل معنی ہیں حساب اور محاسبہ کرنا۔ حدیث میں آتا ہے۔

"اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ"

یعنی وہ شخص بڑا ہوشمند ہے، جو اپنے نفس سے محاسبہ کرتا رہے یعنی اس کی نگرانی رکھے۔

اسی سے دیّان، اللہ کا وصفی نام بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں جزا دینے والا۔ لہٰذا "الدین" کے معنی ہیں جزا و سزا۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ مذکور ہے۔

"اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ"

یعنی آپ نے اس شخص کو دیکھا، جو جزا و سزا یعنی آخرۃ کو جھٹلاتا ہے۔

سورۂ کافرون میں ہے۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ

یعنی تمہارے کئے کا بدلہ تمہارے لئے ہے اور میرے کئے کا بدلہ میرے لئے ہے۔

"نیز" الدین" کے معنی مجموعہ احکام شریعت اور خود شریعت کے

بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" — آج میں نے تمہارے لئے تمہاری شریعت کو مکمل کر دیا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ — اللہ کے نزدیک مذہب صرف اسلام ہے۔

یہاں دین کے معنی جزا اور بدلہ کے ہیں۔ اس لقب کا حاصل یہ ہوا کہ ایک دن اور زمانہ مقرر ہے جس میں ظالم و مظلوم بدعمل اور نیکوکار سب کو ان کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا اور حساب و کتاب کے اس دن میں تمام مجازی ملکیتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور اللہ کی حقیقی ملکیت کا ظہور پورے طریقہ پر ہو گا۔

سورۂ فاتحہ جس کی حقیقت بارگاہِ خداوندی میں ایک فدویانہ عرضی اور نیازمندانہ درخواست کی ہے اس کے ابتدائی اور سرتحریر شاہانہ القاب کی مناسب اور ضروری تشریح پیش کی جا چکی ہے۔

یہ شاہی القاب دراصل حق تعالیٰ کے وہ اسماءِ حسنیٰ ہیں۔ جن کے ذریعہ اللہ کو پکارنے کی ہدایت خود قرآن کریم نے دی ہے۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا — اللہ ہی کے لئے اسماءِ حسنیٰ ہیں انہیں کے ذریعہ سے اسکو پکارو

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ۔ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی — اے نبی آپ فرما دیجئے کہ تم اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہکر جو نسے نام سے بھی پکارو یہ سب اسکے اسماءِ

حسنیٰ ہیں۔

قرآنِ کریم میں ان الفاظ کو جن سے اللہ کو پکارا جا سکتا ہے اسماء حسنیٰ کہا گیا ہے جس کا ترجمہ ہے حسن اور خوبی والے نام اور جو ذات منبع کمال اور سرچشمۂ محاسن ہو اس کو خوبی اور حسن کے ناموں ہی سے پکارنا زیب بھی دیتا ہے جس لفظ میں نقص و قصور اور برائی کا شائبہ بھی موجود ہو اللہ کے لئے نہ ایسے لفظ کا استعمال جائز ہے اور نہ اسماء الٰہیہ میں اس کا شمار ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اسماء حسنیٰ میں سے بھی کسی اسم کا اس طرح استعمال کرنا جائز نہیں ہے جس میں نقص و اہانت کا پہلو نکلتا ہو جیسے لفظ خالق۔ اسماء حسنیٰ میں سے اللہ کا ایک نام ہے مگر اللہ کو خالق الحمار گدھے کا خالق، خالق الخنزیر۔ خنزیر کا خالق اور خالق الخمر شراب کا خالق کہنا ناجائز اور انتہائی بے ادبی ہے۔

اصل میں اسم اور نام کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر اسم اور ہر نام اپنے مسمیٰ اور ذات کے لئے تعارف و پہچان کا ایک ذریعہ اور واسطہ ہے خواہ وہ نام اللہ کا ہو یا غیر اللہ کا۔ علماء اہلِ لغت کے نزدیک اسم کے لغوی معنی بھی علامت اور نشانی کے ہیں۔ نام اگر ذاتی ہے تو اس کا تعارف صفات و کمال سے قطع نظر صرف ذات تک محدود رہے گا۔ اور اگر نام وصفی اور صفتی ہے تو اس کا تعارف اس صفت اور کمال سے متعلق ہو گا جس کا اظہار اس لفظ سے کیا جا رہا ہے حق تعالیٰ کے اسماء گرامی بھی انہیں دو قسموں پر مشتمل ہیں ذاتی وصفاتی اسکے ناموں میں ذاتی نام صرف اللہ ہے اور باقی تمام نام صفاتی ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں اللہ کے صفاتی نام مذکور ہیں یا جملوں

اور عبارتوں کی شکل میں اس کے اوصاف کا اظہار کیا گیا ہے، وہاں ان کی غرض و غایت اور اولین مقصد اللہ کی ایسی خصوصیات اور صفات سے انسان کو روشناس کرانا ہے جو اللہ کو غیر اللہ سے ممتاز کردیں اور واحدیت اور یکتائی کا عقیدہ دل و دماغ میں پیوست کردیں گویا ہر اسم الٰہی اور وضعی نام اپنی اپنی جگہ اللہ کی کسی نہ کسی شان اور کسی نہ کسی خصوصیت کا شاہی اعلان اور سرکاری خبر ہے جس نے دل و دماغ کی آنکھوں سے ان تمام حجابات کو اٹھا دیا جو جہالت وتوہم اور رنگ و بو کی فریب کاریوں نے ان پر ڈال رکھے تھے بلکہ گم کردہ راہ اور بھٹکے ہوؤں کو آستانۂ قدس کی منزل مقصود تک پہنچا دیا ہے

نارِ دوزخ میں لئے جاتی تھی میری کج روی
آپ نے خود ہی بچایا میں تو اس قابل نہ تھا
فخر کرتا جو تیوں میں بھی اگر ملتی جگہ
مجھ کو پہلو میں بٹھایا میں تو اس قابل نہ تھا

ایک لمحے کے لئے سوچئے کہ اس عالم امکان میں مشاہدۂ ذات کا تو اس لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ دنیاوی جسم کی آنکھوں میں اللہ کو بے پردہ دیکھنے اور اس کے دیدار کرنے کی سرے سے صلاحیت و استعداد ہی نہیں ہے حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی "لَن تَرَانِی" کا مایوس کن جواب سنکر نظارہ کی ایک جھلک ہی پر قناعت کرنی پڑی۔ اب اگر اللہ کی طرف سے اسماء و صفات الٰہیہ کے سرکاری اعلان کا سلسلہ بھی نہ ہوتا تو تلاش حق اور معرفتِ الٰہی کی کیا سبیل ہو سکتی تھی؟ اس حرمان نصیبی کے نتیجہ میں ہم بھی دنیا کی دوسری گمراہ اور

باطل پرست قوموں کی طرح ذات و صفات کی پُرخطر اور لق و دق وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے کبھی کے ہلاک ہو چکے ہوتے۔ پس ہر صفتی نام سے جو مفہوم مترشح ہوتا ہے اور جو اثر دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ ہی اللہ کی معرفت اور توحید ہے وہ اثر خواہ جود و مہر سے متعلق ہو اور خواہ عذاب و قہر سے۔ اثر و تاثیر کے اس فرق کی بناء پر علماءِ عارفین نے کل اسماءِ الٰہیہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جلالی و جمالی۔ جو غلبہ و قہر، سزا و عذاب کے معانی اور اثرات کے حامل ہیں وہ کل اسماء جلالی کہلاتے ہیں اور جو رأفت و رحمت اور فضل و کرم کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں وہ سب نام جمالی کہلاتے ہیں۔ حضرات صوفیائے کرام کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ کی کل مخلوقات اللہ کے کسی نہ کسی نام کی مظہر ہے اور جس طرح اسماءِ الٰہیہ بعض جلالی ہیں اور بعض جمالی اسی طرح مخلوقات میں بھی بعض مخلوق جلالی ہے جیسے شیر اور درندے جانور وغیرہ اور بعض مخلوق جمالی ہے جیسے ملائکہ یا نفع بخش حیوانات و اشجار وغیرہ۔

اسماءِ جلالی کی تاثیر خوف و دہشت اور سراسیمگی ہے اور جمالی ناموں کا اثر امید و رجاء اور اطمینانِ قلب ہے، صفتِ جلال کو سن کر انسان پتے کی طرح کانپنے لگتا ہے اور صفتِ جمال سے ایسا سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے جیسے کوئی بچہ ماں کی گود میں پہنچ گیا۔

اللہ کی جمالی و جلالی شانوں کا ظہور جب عام مخلوقات میں ہوتا ہے تو اس کو مظہرِ جمال اور مظہرِ جلال کہا جاتا ہے۔ اور جب کلامِ خداوندی میں یہ دونوں شانیں جلوہ گر ہوتی ہیں خواہ اسمِ الٰہی کے ذریعہ سے

ہوں یا مضمونِ کلام کے ذریعہ سے تو اس کو ترغیب و ترہیب یا بشارت و انذار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جنت، اہلِ جنت اور نعماءِ جنت کا ذکر ترغیب ہے اور جہنم، اہلِ جہنم اور عذابِ جہنم کا ذکر ترہیب تمام وعدے ترغیب ہیں اور تمام وعیدیں ترہیب انعام و احسان کا ذکر ترغیب ہے اور پستی و زوال کا ذکر ترہیب مضامین شکر ترغیب ہیں اور مضامین ضبر ترہیب

پس کل عالم ارضی و سماوی بھی صفتِ جمال و جلال کا مظہر ہے اور کلامِ خداوندی بھی کل کا کل اللہ کی جمالی و جلالی شان یعنی ترغیب و ترہیب کا آئینہ دار ہے۔ انسان کی بناوٹ اور تخلیق میں بھی اللہ تعالیٰ نے تاثر و انفعال کی یہی دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ ایک خوف دوسری طمع یعنی انسان کبھی لالچ و طمع اور کسی چیز کے شوق میں اطاعت و فرماں برداری کرتا ہے اور کبھی کسی خطرہ اور اندیشہ سے ڈر کر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ حق تعالیٰ نے کلامِ الٰہی میں انسان کی انہیں دو اثر پذیر قوتوں کو جھنجھوڑا ہے اور خوف و طمع کے انہی دو جذبات کو حرکت دی ہے۔ مضامین ترغیب سے جذبۂ طمع ابھرتا ہے اور مضامین ترہیب سے جذبۂ خوف میں تحریک ہوتی ہے۔ ایمان و عمل میں استواری اور استحکام کے لئے بھی جذبات خوف و طمع کا امتزاج اور دونوں کی آمیزش ضروری ہے۔ تنہا ایک کیفیت کا وجود یا ایک کیفیت کا غلبہ ایمان و عمل دونوں کے لئے مضر بلکہ بعض اوقات مہلک ہے۔ اگر انسان پر کیفیت خوف کا غلبہ ہو جائے تو بعض اوقات اس کا انجام رحمتِ خداوندی سے مایوسی اور ڈھٹائی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب کوئی انسان

اپنے تئیں یہ طے کرلے کہ ہر حال میں میری معافی کا کوئی ادنیٰ سا بھی امکان نہیں ہے تو پھر وہ جرم اور خلاف ورزی میں بیباک اور نڈر ہو جاتا ہے اور پھر کھل کر گناہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے بالکل اسی طرح جیسے بارش کے موسم میں کوئی شخص پوری احتیاط کے ساتھ کپڑے سمیٹ کر چل رہا ہو لیکن تھوڑی دیر میں اسے اطلاع ملتی ہے کہ پیچھے سے تمام کپڑے کیچڑ میں ملوث ہو گئے، تو اب وہ شخص احتیاط چھوڑ کر پوری بے فکری کے ساتھ پانی میں کیچڑ اچھالتا ہوا جائے گا۔ کیونکہ کیچڑ سے محفوظ رہنے کے سلسلہ میں وہ قطعی طور پر مایوس ہو چکا ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد باری ہے۔

لَا تَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ	اللہ کی رحمت سے نا امید مت ہو
إِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ	کیونکہ اللہ کی رحمت سے بجز
اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ	کافروں کے کوئی نا امید نہیں ہوتا

علیٰ ہذا اگر امید و رجا اور جذبہ طمع غالب آجائے تو پھر شانِ غفاری پر بے جا طریقہ سے بھروسہ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس غلط بھروسہ کی وجہ سے عمل سے بے نیاز ہو جاتا ہے پس الگ الگ یہ دونوں کیفیتیں ناکافی بلکہ مضر ہیں۔ البتہ دونوں کا مجموعہ اور امتزاج کمال ایمان کا ذریعہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔

اَلْإِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ	یعنی کامل درجہ کا ایمان وہ ہے جو
وَالرَّجَا	امید و بیم اور خوف و طمع کے درمیان ہو

یعنی ایک طرف صرف اتنی مقدار میں خوف ہو کہ معصیت و نافرمانی

سے بچتا ہے اور دوسری طرف اللہ کی رحمت سے مغفرۃ کی اتنی امید بھی ہو کہ ذوق و شوق کے ساتھ اللہ کی بندگی میں مصروف رہے۔
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے فرمایا میرے دل میں اللہ کا خوف اور ڈر اتنا ہے کہ قیامت میں اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ حضور کی امت کا صرف ایک ہی شخص جہنم میں جائے گا۔ تو مجھے یہ یقین ہو گا کہ وہ ایک شخص صرف میں ہوں گا۔ اور مجھے اللہ کی رحمت سے اتنی زیادہ امید بھی ہے کہ اگر قیامت میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ جنت میں صرف ایک ہی امتی جائے گا تو مجھے یہ یقین ہو گا کہ وہ جنتی شخص صرف میں ہوں۔ ایمان و عمل میں یہی کمال پیدا کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں ترغیب کے ساتھ ترہیب و خوف کے ساتھ رجاء کے مضامین بیان فرمائے ہیں۔

چنانچہ سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں جو اسماء الٰہیہ مذکور ہیں، ان میں ذاتی نام بھی ہیں اور صفاتی بھی۔ جمالی نام بھی ہیں اور جلالی بھی۔ شانِ ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی مضمونِ خوف بھی ہے اور امید و رجاء بھی۔

مذکورہ بالا پانچ اسماءِ الٰہیہ میں لفظ اللہ اسمِ ذات ہے اور باقی چار صفاتی ناموں میں یا شاہی و سرکاری القاب میں تین اسماءِ الٰہیہ جمالی ہیں اور آخری ایک نام یا لقب جلالی ہے۔ تین صفاتی ناموں کے مفہوم میں ترغیب ہے اور چوتھے صفتی نام میں ترہیب و انذار ہے۔ صفتِ ربوبیت اور صفتِ رحمانی و رحیمی امیدوں پر امیدیں قائم ہوتی ہیں۔ کرم بالائے کرم کی توقع پیدا ہوتی ہے اس ترغیبی و رجائی کیفیت کے ساتھ ترہیب و خوف کی جھلک اور آمیزش پیدا کرنے کے لئے "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"

فرمایا۔ تاکہ طمانیت کے ساتھ دل میں تھوڑی سی کھٹک بھی پیدا ہو جائے اور وفورِ کرم کے ساتھ اندیشہ احتساب بھی لاحق ہو جائے

وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو
غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

چار صفاتی ناموں میں صرف ایک جلالی نام کے تناسب سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کا اعلان، سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ اپنی جگہ کتنا سچا اور صحیح ہے۔

اسمائِ الٰہیہ اور اسمائِ حسنیٰ کے بارے میں توجہ طلب اور قابلِ غور دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ کل اسمائِ الٰہیہ خواہ ذاتی ہوں یا صفاتی جلالی ہوں یا جمالی سب کے سب سماعی اور توقیفی ہیں یعنی جتنے الفاظ قرآن و حدیث میں حق تعالیٰ کے نام کے طور پر منقول ہیں اور جس ہیئت ترکیبہ کے ساتھ منقول ہیں صرف وہی الفاظ اسمائِ الٰہیہ اور اسمائِ حسنیٰ ہو سکتے ہیں اور اللہ کو صرف انہی ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔ باقی اپنی طرف سے کسی لفظ کو وضع کر کے یا اسم الٰہی کی اصل حقیقت میں تغیر و تبدل کر کے نہ اللہ کے لئے بطور نام کے تجویز کر سکتے ہیں اور نہ ان اختراعی الفاظ سے اللہ کو پکارا جا سکتا ہے۔ جیسے۔

هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ — وہی مجھے کھلاتا ہے اور وہی مجھے پلاتا ہے۔

کے مفہوم اور مضمون سے استنباط کر کے اللہ کا نام مطعم و ساقی رکھ دیا جائے۔ یا مالک الملک اور مالک یوم الدین کی ہیئت کذائی کو بدل کر اللہ کا نام مالک السماء اور مالک اللیل رکھ دیا جائے تو یہ

خانہ ساز اور اختراعی الفاظ اس لئے اسماء الٰہیہ نہیں ہو سکتے کہ یہ قرآن وسنت میں یا تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں اور یا اس صورت وہیئت کے ساتھ منقول نہیں۔ اور اس کی فلاسفی یا منطقی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ہستی اور اس ہستی کے جملہ کمالات کی حقیقت اپنی جگہ خود بھی اختراعی اور ہماری تجویز کردہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی سماعی اور توفیقی ہے۔ پس اس ذات اور اس ذات کی صفات کی تعبیر کے لئے الفاظ بھی اس اللہ کے تبلائے ہوئے ہونے چاہئیں جس کے اپنے یہ کمالات واوصاف ہیں۔ ان کی تعبیر وتفہیم کے لئے ایک نابلد اور ناآشنا مخلوق انسانی کی طرف سے تجویز کردہ الفاظ کیسے کافی ہو سکتے ہیں ؎

تو ندیدی گہے سلیمان را ۔۔۔ چہ شناسی زبان مرغاں را

پس اسماءِ حسنٰی اور اسماءِ الٰہیہ حقیقت میں شاہی اعلانات اور سرکاری خبریں ہیں جن کی غرض وغایت اور اولین مقصد اللہ کی ان خصوصیات اور ان کمالات سے انسان کو آگاہ کرنا ہے جن کی صحیح معرفت اور جن سے تفصیلی واقفیت کا ذریعہ ان اعلانات اور خبروں کے سوا کوئی اور ممکن ہی نہیں ہے۔ عالم امکان کی ایک مخلوق کی حیثیت میں اگر ہم نے اللہ کی ان سرکاری خبروں سے صرف نظر کر کے ذات واجب تعالےٰ شانہ کی خصوصیات اور اس کے اوصاف معلوم کرنے کے لئے اندھیرے میں عقل کے تیر چلائے بھی تب بھی ایک ممکن کی پرواز فکر عالم امکان کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اللہ کو اپنے سے برتر مگر اپنے ہی جیسا سمجھ سکتے ہیں۔

پھر جس طرح انسانی ہاتھ سے تراشی ہوئی مورتی اللہ نہیں ہو سکتی

اسی طرح عقل و خرد کا اختراعی مرقع اور فکر انسانی کا تراشا ہوا مجسمہ اور ہیکل اللہ کیسے ہو سکتا ہے ۔

اے عقل دلائل پیش نہ کر اثباتِ وجودِ باری میں
اللہ کو بھی ایک بت نہ بنا اس دنیا کے بتخانے میں

حاصل یہ کہ اسمائے حسنیٰ اور اللہ کے صفاتی نام شاہی اعلان اور سرکاری خبروں کا درجہ رکھتے ہیں اور انہی کے ذریعہ اور واسطہ سے ہمیں اللہ کی ذات و صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے لیکن اسمائے الٰہیہ اور صفاتی ناموں کی افادیت اور تاثیر صرف ہماری آگاہی اور واقفیت تک ہی محدود نہیں ہے ۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مؤمن کے لئے
لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

بلکہ ہر صفتی نام اور ہر اسم الٰہی اپنی اپنی جگہ ایک مستقل حکم عمل اور مستقل پیغام اصلاح بھی ہے ۔ علم بیان اور بلاغت کے ماہرین علماء نے لکھا ہے کہ ہر اعلان اور خبر کا ظاہر خبر ہے مگر ہر خبر اور اطلاع کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ انشا ہے ۔ یعنی وہ ہی مقصد حکم وہدایت اور پیغام عمل ہے جیسے ۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ — کائنات کی ہر چیز فانی ہے ۔

خبر ہے ۔ لیکن مقصد خبر یہ ہے کہ دنیائے فانی سے دل نہ لگاؤ اور باقی و دائم آخرۃ کو نصب العین بناؤ ۔ عذاب جہنم خبر ہے ۔ مقصد خبر اس سے بچنے کی ہدایت ہے ۔ جنت و اہلِ جنت کے حالات خبر ہیں مقصد خبر نیک کاموں کی طرف ترغیب ہے ۔ کسی بے ادب اولاد کو باپ کی طرف سے یہ خبر دینا کہ میں تمہارا باپ ہوں صرف خبر اور واقعہ کا اظہار ہی نہیں ہے بلکہ یہ حکم وہدایت بھی اسی میں مضمر ہے کہ تم میری تعظیم کرو

وغیرہ وغیرہ۔
چنانچہ اسماءِ الٰہیہ اور اسماءِ حسنیٰ ایک طرف ناواقف و نابلد انسانوں کو اللہ کے اوصاف و کمالات کی جھلک دکھا کر آشنائے حقیقت بناتے ہیں تو دوسری طرف کمالاتِ خداوندی کا عملی پیکر بننے اور صفاتِ الٰہیہ کا نمونہ بننے کی دعوت اور ہدایت بھی دی جا رہی ہے۔
حدیث میں آتا ہے۔

اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ	بے شک اللہ کے ننانوے نام
اِسْمًا مَنْ حَفِظَہَا دَخَلَ	ہیں جو انہیں محفوظ کر لے گا
الْجَنَّۃَ	وہ جنت میں داخل ہو گا۔

محققین علماء نے ناموں کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مقصد صرف زبانی یاد کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے آگے ان اسماءِ الٰہیہ کے ساتھ تخلق و تشبہ حاصل کرنا بھی ہے۔ حق تعالیٰ اپنے صفتی اسماء کا ذکر فرما کر یہ حکم دے رہے ہیں کہ اے انسان میں بے جسم ہے کہ کوئی مجھے دیکھ سکے نہ چشم و ابرو اور دست بازو ہیں کہ ان سے میرے کمالات و اوصاف کا ظہور نظر آسکے۔ اس لئے ہم نے اپنے محاسن اور اپنے کمالات کی جلوہ نمائی کے لئے انسان کو اپنا آئینہ بنایا ہے کسی عارف نے اس مفہوم کو خوب ادا کیا ہے ؎

درصورتِ قطرہ سر بسر دریا ئیم	تو ذرہ مبیں مہر جہاں آرا ئیم
گویند کہ کنہ ذات او نتواں یافت	ما یافتہ ایم وانکہ کنہش ما ئیم

یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں اللہ کی صورت پر انسان کی پیدائش کا ذکر ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی	یعنی اللہ نے آدم (انسان) کو اپنی
صُوْرَتِہٖ	صورت (ہیئت) پر پیدا فرمایا ہے

یعنی جو صفاتِ الٰہیہ کا نظارہ کرنا چاہے وہ انسان میں ان کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ اسی لئے انسان کو صفات خداوندی کا مظہر اتم کہا گیا ہے کہ صفات درحقیقت اللہ کی ہیں صرف ان کا ظہور اور جلوہ اس آئینہ میں نظر آتا ہے ؎

سنوارا ہے کس درجہ بگڑے ہوئے کو
مجھے دیکھ آئینۂ یار ہوں میں

یعنی سارا جلوہ محبوب کے حسن کا ہے۔ آئینہ کا کوئی کمال نہیں محبوب اگر سامنے سے ہٹ جائے تو آئینہ شیشے کے ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں ہے، حدیث میں آتا ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ اے انسانو! اللہ کے برتاؤ اس کے کمالات اور اس کی صفات کا رنگ اپنی عملی زندگی میں پیدا کرو تاکہ مظہریت و خلافت کا پورے طور پر اظہار ہو سکے۔

پس سورۂ فاتحہ کے آغاز میں جتنی صفاتِ الٰہیہ اسماءِ حسنیٰ یا القاب ذکر کئے گئے ہیں وہ خصوصیات خداوندی کا پتہ بھی دیتے ہیں اور تخلّق و تشبّہ کی دعوت بھی۔

"الحمد للہ" میں اللہ کی صفت محمودیت کا اظہار بھی ہے اور یہ اشارہ بھی کہ ایک مؤمن کو ہر برائی اور مذمت سے الگ رہنا چاہیئے اور وہ نیکیاں اور اچھائیاں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں جن سے محمودیت کی شان جھلکنے لگے "رب العالمین" میں اللہ کی ہمہ گیر صفت ربوبیت کا اعلان بھی ہے اور ہمارے لئے یہ ہدایت بھی کہ اپنی صلاحیت و سکت کے مطابق جس قدر ممکن ہو سکے دوسرے کی ضرورت و حاجت میں سہارا لگانا چاہیئے تاکہ ربوبیت باری کی تجلی ہماری پیشانیوں پر چمکتی ہوئی نظر آئے "رحمٰن و رحیم" میں اللہ

کی رحمت ورافت کا ذکر بھی ہے اور ہمارے لئے یہ حکم بھی کہ "اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ" ؎

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر — خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

"مالِکِ یومِ الدین" میں اللہ کی صفت عدل اور اسکی منصفانہ شان کا اظہار بھی ہے۔ اور تخلق وتشبہ کی بنا پر ہمارے لئے یہ فرمان بھی ہے کہ عدل وانصاف کو اپنا شعار بنالو اور ظلم وجور سے اپنے کو دور رکھو تاکہ انسانوں کی پیشانیوں سے اللہ کی شان عدل کا نور چمکتا ہوا نظر آئے۔

پس کامل درجے کا مسلمان وہ ہی ہے جو صحیح معنی میں صفات الٰہیہ کا مظہر ہو اور "تخلقوا باخلاق اللہ" کا نمونہ ہو۔ حدیث میں اہل اللہ اور خاصان خدا کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"خِیَارُکُمُ الَّذِیْنَ اِذَا رُؤُا ذُکِرَ اللّٰہُ" — تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جنکو دیکھنے سے خدا یاد آئے"

اسی لئے ایسے علمائے ربانیین اور اہل اللہ کو حجۃ اللہ فی الارض (روئے زمین پر اللہ کی دلیل وحجت) کہا جاتا ہے کہ یہ حضرات صفاتِ خداوندی کا مظہر اور کمالاتِ الٰہیہ کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر غیر شعوری طور پر اللہ سے لو لگ جاتی ہے، اسی حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے اس انداز میں بیان کیا ہے ؎

تیرا جلال وجمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل وجمیل تو بھی جلیل وجمیل

فدویانہ تعارف

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ — ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں

سورۂ فاتحہ یعنی حق تعالیٰ کی بتلائی ہوئی فدویانہ عرضی کے جملہ مضامین پانچ عنوانات یا پانچ ابواب پر تقسیم کر دیئے گئے تھے پہلا اور ابتدائی باب فدویانہ عرضی کے شاہانہ القاب یعنی اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ الٰہیہ سے متعلق تھا جو حسبِ توفیق اور بقدرِ ضرورت تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا چکا۔ اور اب اس سلسلے کا دوسرا باب یا دوسرا مضمون شروع کیا جا رہا ہے۔ جو عرضی گزار بندہ کی نیاز مندی اور اطاعت شعاری سے متعلق ہے گویا پہلا باب صفاتِ الوہیت کا تھا اور یہ دوسرا باب بندگی و غلامی کا ہے۔ پہلے باب میں ربوبیتِ باری کا تعارف تھا۔ اور دوسرے باب میں انسان کی عبودیت کا تعارف ہے۔

پہلے باب میں توحید کا ذکر تھا، دوسرے باب میں مقتضائے توحید یعنی عبادت کا ذکر ہے۔ یہ دونوں ابواب مضامین اور عنوان کے اعتبار سے اگرچہ الگ الگ اور مستقل ہیں مگر معنوی لحاظ سے دونوں میں اتنا گہرا اور خصوصی ربط و تعلق ہے کہ گویا دونوں میں صرف تعبیر اور الفاظ ہی کا فرق ہے۔ خلاصہ اور ماحصل دونوں کا ایک ہے۔ کیونکہ صفاتِ الٰہیہ کا تعارف ہو یا انسان کی شانِ عبدیت کا، معرفتِ حق ہو یا معرفتِ خلق، ربوبیت کا بیان ہو یا عبودیت کا، اللہ کی شانِ حاکمیت کا ذکر ہو یا بندے کی محکومی

اور غلامی کا مقصد سب کا عابد و معبود میں کامل امتیاز اور خالق و مخلوق میں واضح اور نمایاں فرق ظاہر کرنا ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

اور یہ کلی امتیاز اور فرق اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ کاملہ سے بھی اسی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جس طرح بندہ کی شان بندگی اور اس کی عبدیت سے نکھری ہوئی توحید نظر آتی ہے۔ معرفت الوہیت میں عنوان اگرچہ الٰہی اور خداوندی ہے۔ مگر درحقیقت اس آئینہ میں انسان کی عبودیت کے خد و خال دکھلائے جا رہے ہیں۔ اور معرفت عبودیت کا عنوان اگرچہ فدویانہ و نیازمندانہ ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پردے میں آقائے حقیقی اور خداوند قدوس کے کمالات کی جلوہ نمائی اور تجلی مقصود ہے ؎

انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے

مقصد و خلاصہ کی اس وحدۃ کا اظہار سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں یوں فرمایا ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ — جس انسان نے خود اپنے کو پہچان لیا
عَرَفَ رَبَّهٗ — توفی الواقع اس نے اپنے رب کو پہچان لیا

یعنی معرفتِ عبودیت سے ربوبیت کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور معرفتِ ربوبیت سے عبودیت کی۔

دونوں ابواب کے اس باہمی گہرے ربط اور تعلق سے کلام خداوندی کی لطافت، بے ساختگی، اور اس کے کمالِ اعجاز کا اندازہ ہوتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے دو جملوں سے اس

قدرتی اور فطری تاثر کا اظہار ہے جو سابقہ پانچ صفات الٰہیہ کو سنکر ایک سلیم العقل اور صحیح الحواس انسان پر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ صفات الٰہیہ سے عظمت و جلال، محبت و ہیبت کے ملے جلے جذبات جب انسان کے دل و دماغ پر چھا گئے تو اس نے فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور معاً اپنے سجدۂ تذلل سے اللہ کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کیا۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ

دو ایسے پہلوانوں میں کشتی ہو رہی تھی جو ایک دوسرے کے حال سے واقف اور متعارف نہ تھے۔ دورانِ کشتی کسی نے ایک پہلوان کے کان میں یہ بات ڈالدی کہ مدمقابل پہلوان رستم زماں ہے اور تمام پہلوانوں کا استاد ہے۔ وہ پہلوان یہ سنتے ہی کانپنے لگا اور دہشت کھا کے زمین پر گر گیا۔ اگر انسان اپنے ہی جیسے ایک انسان کی بڑائی و برتری سے دہشت کھا کر زمین پر گر سکتا ہے تو کیا انسان اللہ کی عظمت و کبریائی اور اس کی شان و جمال سے مغلوب ہو کر اس کے قدموں میں نہیں گر سکتا؟

حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی بندہ سجدہ کرتا ہے تو بندہ کا سر اللہ کے قدموں میں ہوتا ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اللہ کی حقیقی معرفت گیرو سے رنگے ہوئے کپڑوں کے رنگ کا یا ظاہری خرقہ پوشی اور سر تراشیدہ ہیئتِ قلندری کا نام نہیں ہے بلکہ انسانی دل و دماغ پر صفات الٰہیہ کے اس پختہ رنگ کا نام ہے جو انسان کو اللہ کے قدموں میں گرا دے سجدہ میں جھکا دے اور سر تا پا اطاعت بنا دے ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا وہ پھر لہو کیا ہے

اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ عبادت وہ ہی عبادت کہلانے کی مستحق ہے جس میں اللہ کی عظمت و کبریائی اور اسکا جلال و جمال چہرہ کی آنکھوں سے نہیں دل کی آنکھوں سے نظر آرہا ہو اور ہیبت و عظمت کے اثرات ہمارے جسم و بدن سے ظاہر ہو رہے ہوں۔ عبادت کا یہ مقام اور یہ درجہ سب سے زیادہ بلند اور سب سے زیادہ افضل ہے کہ جس میں نہ امید ثواب ہے اور نہ اندیشہ عقاب بلکہ محض شانِ الوہیت کا تقاضا اور اظہار عبودیت کا جذبہ کارفرما ہے۔

در بدن داری اگر سوز حیات | ہست معراج مسلماں در صلوٰۃ
ورنہ داری خونِ گرم اندر بدن | سجدۂ تو نیست جز رسم کہن

بندہ کی عبودیت یا فدویانہ تعارف کا یہ دوسرا باب جس طرح پہلے باب کا قدرتی اور فطری نتیجہ اور اثر ہے اسی طرح یہ باب آنیوالے تیسرے باب کی تمہید اور اس کا دیباچہ بھی ہے جس میں حرف مدعا اور درخواست کا اصل مقصد پیش کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ درخواست کی قبولیت اور عرضی کی منظوری میں عرضی گذار کی طرف سے اظہار نیاز مندی و وفا شعاری کو بڑا دخل ہے۔ اسی لئے "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" میں طرز عبارت اور انداز کلام بھی بدل دیا گیا شاہی القاب اور صفات الٰہیہ میں انداز کلام غائبانہ تھا۔ کیونکہ صفات کا مقصد ثنا ہے اور تعریف کے لئے غائبانہ عنوان بہتر ہے۔ اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ "تمہید سوال ہے اور سوال و دعا کے لئے خطابی و حضوری انداز کلام افضل ہے۔

کیونکہ سخی و کریم آقا کی شرافت و مروت اور کریمانہ غیرت سامنے پھیلے ہوئے دست سوال کو کبھی رد نہیں کر سکتی۔ اسی لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنی دعاؤں میں خطابی عنوان اور

حضوری انداز کلام اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اکل شجرہ کی لغزش پر اللہ سے دعا کی اور معافی کے خواستگار ہوئے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر آپنے ہماری پردہ پوشی نہ کی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اور حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

اے ہمارے پروردگار ہماری جانب سے قبول فرما کہ تو بیشک سننے والا، جاننے والا ہے

فدویانہ تعارف اور معرفت عبودیت کے اس دوسرے باب میں صرف دو جملے ہیں ایک "ایاک نعبد" دوسرا اور ایاک نستعین" پہلا جملہ عبادت سے متعلق ہے اور دوسرا استعانت سے۔ ترتیب وار دونوں جملوں کی تشریح ضروری ہے

"ایاک نعبد" (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں) والے جملے میں عابد، معبود، اور عبادت تینوں کا ذکر ہے۔

مفسرین علماء نے لکھا ہے کہ اظہار نیازمندی کے اس موقع پر نہ خود کو پیش پیش رکھنا مناسب ہے اور نہ اپنی عبادت کو۔ کیونکہ اس میں اپنی یا اپنے عمل کی برتری اور بڑائی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ تکبر و نخوت ہے جو اظہار عاجزی کے موقع پر کسی طرح موزوں نہیں ہے اس لئے معبود کو سب سے پہلے ذکر کیا گیا اور عابد و عبادۃ کو مؤخر کیا گیا۔

چنانچہ "ایاک نعبد" میں لفظ ایاک جس میں اللہ کو خطاب ہے اس کی تقدیم میں حق تعالیٰ کی تعظیم اور اس کا احترام بھی ہے اور معنوی اعتبار سے تخصیص اور حصر بھی۔ حصر ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا خلاصہ کسی مفہوم کی تخصیص اور معنی کی حد بندی کر دینے کے ہیں جس کے لئے عربی میں مستقل کلمات حصر بھی ہیں اور اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کلام کی ترتیب میں اس طرح رد و بدل کر دیا جائے کہ بعد والا جزو پہلے کر دیا جائے اور پہلے والا جزو بعد میں اس سے مفہوم میں تخصیص و تحدید پیدا ہو جاتی ہے۔ اور عربی میں یہ طریقہ عام ہے۔ ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک شخص نے کسی راہگیر کو گالی دی۔ راہ گیر نے سن کر خاموشی اختیار کی۔ گالی دینے والے نے آگے بڑھ کر کہا "ایاک اعنی" میرا مقصد صرف تجھی کو گالی دینا تھا۔ راہ گیر نے جواب دیا "وعنک اعرض" میرا مقصد بھی صرف تجھ ہی سے منہ پھیرنا تھا۔ علیٰ ہذا "ایاک نعبد" میں بندگی اور عبادت کو ذات خداوندی کے ساتھ مختص و محدود کر دیا گیا ہے گویا کہ بندگان خدا اللہ کی بارگاہ میں کہہ رہے ہیں "نعبدک ولا نعبد سواک" یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ عبادۃ و معبود کے علاوہ اس جملہ کا تیسرا جزو عابد اور عرضی گزار سے متعلق ہے۔

حضرات مفسرین نے لکھا ہے کہ عابد و عرضی گذار فرد واحد ہونے کے باوجود صیغہ جمع کے ساتھ یعنی اجتماعی انداز میں عبادۃ اور درخواست کو پیش کر رہا ہے، کیونکہ انفرادی انداز میں انانیت اور خود پسندی کا شائبہ نظر آتا ہے جو نہ مضمون مناجات و دعا کے مناسب ہے اور نہ خود بندہ کی فدویانہ حیثیت کے لئے کسی طرح

موزوں۔ البتہ صیغہ جمع میں فروتنی وخاکساری کا اظہار بھی ہے اور قبولِ درخواست کے لئے جاذب اور مؤثر بھی، گویا کہ ایک بندہ انفرادی حیثیت میں اپنی عبادت اور اپنی عرضی کسی طرح قابل پذیرائی نہیں سمجھتا اس لئے خاصانِ خدا، انبیاء کرام اولیاء عظام سب کے ساتھ شامل کر کے عرضی کو پیش کر رہا ہے کہ اے اللہ اگر یہ درخواست تنہا قابل غور اور قابل پذیرائی نہیں سمجھتا تو دوسروں کی قابل قبول عرضیوں کے ساتھ اس کو بھی قبول فرما۔

سلاطین و بادشاہوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ خالص اور سچے موتیوں کو خریدنے کے وقت موتیوں کے ساتھ وہ دھاگا بھی قبول کر لیتے ہیں جس میں وہ کار آمد اور سچے موتی پروئے ہوئے ہوتے ہیں کسی عارف نے خوب کہا ہے ؎

می پذیرند بداں را بہ طفیل نیکاں
رشتہ واپس ندہد ہر کہ گہر می خرد

اسی لئے عبادت و دعا کے مواقع میں اجتماعیت اور جماعت کی بڑی فضیلت اور اہمیت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

اَلتَّکْبِیْرَۃُ الْاُوْلٰی فِیْ صَلٰوۃِ الْجَمَاعَۃِ۔ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا۔	جماعت کی نماز میں پہلی تکبیر اللہ کے نزدیک دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔

"ایاک نعبد" میں لفظ نعبد عبادۃ سے بنا ہے اور عربی لغت میں اسی کے قریب قریب لفظ عبودیت بھی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ عبودیت کے معنی ہیں رق اور غلامی جس کا تعلق انسانی ملکیت کے ساتھ ہے اور عبادۃ کے معنی ہیں طاعت و بندگی جس کا

تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہے۔ اسی بنا پر عبد کے دو مفہوم ہیں اور عبد کی دو جمع عباد و عبید کے استعمال میں وہ فرق نمایاں اور واضح ہو جاتا ہے۔ عباد کی نسبت اور اس کا استعمال اسماء الٰہیہ کے ساتھ خاص ہے۔ اور عبید کی نسبت اور اس کا استعمال انسانوں کیلئے مخصوص ہے۔

قرآن پاک میں اللہ کے کریم النفس اور شریف بندوں کے بارے میں ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا

رحمٰن کے خصوصی بندے وہ ہیں جو زمین پر متانت اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جہلاء ان کو چھیڑتے ہیں تو سلامتی اور خاموشی سے گذر جاتے ہیں۔

اسی طرح حق تعالےٰ نے اپنے مخصوص بندوں اور اہلِ ایمان کو اپنی مغفرت و بخشش اور رحم و کرم کی خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا۔

نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے بندوں کو بتا دیجئے کہ میں ہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

ایک جگہ ارحم الراحمین نے ان الفاظ میں بشارت دی ہے۔

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ

اے میرے بندو! آج قیامت کے دن نہ تم پر کوئی خوف طاری ہوگا، نہ تمہیں کوئی رنج و غم ہوگا۔

اللہ کے اطاعت گذار بندوں کی ارواح سے قیامت کے روز

خطاب کر کے فرمایا جائے گا۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ" اے مطمئن روح تو میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا اور میری پیدا کردہ جنت میں داخل ہو جا۔

اور لفظ عبید کا استعمال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی میں ہے۔

اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُ الْاِحْسَانِ انسان احسان کے غلام ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری رائے یہ ہے کہ عبادت اور عبودیت دونوں ہم معنی اور مترادف ہیں جس کے معنی غلامی کے ہیں اور اللہ کی بندگی بھی حقیقت میں غلامی کی وہ اعلیٰ قسم ہے جس کے بعد غلامی کا کوئی تصور نہیں۔

اس لغوی معنی کے علاوہ عبادت کے اصطلاحی معنی اور اس کا اصطلاحی مفہوم بھی ہے جس کی تعبیر اور جس کے طریقے ہر مذہب و ملت نے اپنی اپنی روایات اور دینی روح کے مطابق اختیار کئے ہیں، اور اسلام کے علاوہ عام طور پر عبادت کے لوازم یا عبادت کے چند مخصوص مظاہر کو اصل عبادت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن دین اسلام میں چند مخصوص مظاہر عبادت یا پوجا پاٹ کے ظاہری مراسم کو حقیقت عبادت نہیں قرار دیا گیا بلکہ عبادت ایک ایسی ہمہ گیر اور وسیع حقیقت کا نام ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی اور حیات انسانی کے ہر پہلو کو شامل ہے۔ اور مذاہب عالم اور اسلام کے مابین مفہوم عبادت کا یہ فرق دراصل اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ادیان عالم اور جملہ مذاہب انسانی زندگی کا جزو اور ضمیمہ ہیں۔ ان کی ہدایات مخصوص شعبہائے حیات تک محدود ہیں اور بہت سے شعبے دین و

مذہب کی ہدایت وگرفت سے آزاد ہیں۔ اور دین اسلام کل زندگی کا لائحہ عمل اور ضابطۂ حیات ہے جس کی ہدایت اور حکم سے انسان کا ایک سانس بھی آزاد نہیں ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کی عبادت چند مراسم و مظاہر تک محدود ہے۔ اور اسلام کی عبادت کا مفہوم ہمہ گیر اور محیط ہے۔

اسلام میں عبادت کے اصطلاحی معنی کی تشریح سے پہلے خود لفظ عبادت کے تجزیئے اور اس کے متعلقات کی تعیین ضروری ہے اس لفظ کے متعلقات میں ایک خود عمل عبادت ہے۔ دوسرا وہ جس سے عمل عبادت کا صدور ہو یعنی عابد۔ اور تیسرا وہ جس کے لئے عمل عبادت کیا جائے یعنی معبود۔ پس کس عمل کو عبادت کہہ سکتے ہیں؟ اور عابد کسے کہا جاسکتا ہے؟ اور معبود کون ہو سکتا ہے؟

ان تینوں متعلقات کی تعیین ضروری ہے کیونکہ بندہ کا ہر عمل عبادت اور بندگی نہیں ہے کہ کبھی وہ اپنے آقا کے ساتھ تمسخر اور استہزا بھی کرتا ہے۔ ہر فرماں بردار اور اطاعت گذار عابد نہیں کہلاتا جیسی شمس و قمر لیل و نہار کی گردش میں سرگرداں ہیں اور درخت تعمیل حکم میں تصویر بنے کھڑے ہیں اور نہریں تگ و تاز میں منہمک ہیں مگر یہ عابد نہیں کہلاتے کہ اس میں ارادہ و اختیار شامل نہیں ہے علیٰ ہذا اصنام و کواکب کی پرستش کی جاتی ہے، جانور اور درخت کی پوجا کی جاتی ہے۔ لیکن انسانی ہاتھ کے تراشیدہ بت اور دوسرے مصنوعی معبود خود ذلیل و محتاج اور عاجز و درماندہ ہیں معبود ہونے کے اہل نہیں۔

معرفتِ عبودیت یا عرض گذار کے فدویانہ تعارف کے سلسلہ میں عبادت کے تین ضروری متعلقات یعنی عمل عبادت، عابد اور معبود

کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اور انہیں تین متعلقات کی صحیح تعیین کا نام اصطلاحی عبادت ہے۔

مفسرین علماء نے عام طور پر غایۃ تذلل اور غایۃ الخضوع کے الفاظ سے اصطلاحی عبادت کی تشریح فرمائی ہے۔ جس کا مطلب انتہائی تابعداری اور انتہائی پستی کے ہیں اور یہ بھی اپنی جگہ صحیح اور درست ہے مگر یہ تصویرِ عبادت کا صرف ایک رخ ہے جس میں عمل عبادت کی تعیین ہے۔ لیکن عابد و معبود کی تعیین نہیں ہے۔ چنانچہ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس پستی اور تذلل کا اظہار کس کے سامنے اور کس کے لئے ہو۔ اور یہ کہ وہ کس کی طرف سے ہو۔ اس لئے محققین علماء نے اصطلاحی عبادت کی نہایت جامع اور مکمل تعریف اس طرح کی ہے کہ اپنے ارادہ سے ذلت و پستی کا وہ درجہ اختیار کرنا کہ اس کے بعد پستی کا کوئی درجہ باقی نہ رہے اس ذات کے سامنے جس کی انتہائی عظمت و بڑائی کے بعد کسی کی عظمت نہ ہو، یہ اصطلاحی عبادت ہے۔ گویا آخری تذلل، آخری عظمت اور ارادہ و اختیار۔

اصطلاحی عبادت کے یہ تین اجزاء ترکیبی ہیں اور ان کے مجموعہ کا نام عبادت ہے۔ پس اگر تذلل و خضوع تو ہے مگر پستی کا آخری درجہ نہیں ہے جیسے کھڑے کھڑے سر جھکا دینا، یا دو زانو ہو کر بیٹھنا یا رکوع کی طرح جھک جانا وغیرہ تو اس کا نام عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ اس خضوع اور پستی کے بعد بھی اس سے زیادہ پستی کے اور درجے ابھی باقی ہیں اور وہ آخری درجہ جس کے بعد پستی کا کوئی درجہ نہیں صرف یہ ہے کہ جسم انسانی کے سب سے زیادہ عزت والے عضو یعنی سر کو جھکاتے زمین میں ڈال دیا جائے۔ اسی کا دوسرا نام سجدہ بھی ہے یا اسی طرح تذلل و پستی کا یہ درجہ اگر بغیر ارادہ و

اختیار کے ظہور میں آئے تب بھی وہ عبادت نہیں ہے جیسے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں پتھر کے بارے میں فرمایا۔

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ — اور حقیقت یہ ہے کہ بعضے پتھر اللہ کے ڈر سے نیچے گر پڑتے ہیں۔

پتھر کا زمین میں گرنا غیر اختیاری اور غیر ارادی ہے کیونکہ انسان اور جن کے علاوہ کسی میں قصد وارادہ کی قوت اور صلاحیت موجود نہیں ہے۔ البتہ وہ احساس اور شعور موجود ہے جس سے خوف خدا اور خشیتہ الٰہی پیدا ہو اور یہ شعور واحساس درجہ بدرجہ حیوانات نباتات اور جمادات حتیٰ کہ کواکب وسیارات میں بھی موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے خالق کو پہچانتے بھی ہیں اور اس کی بارگاہ میں تسبیح وتحمید کے نغموں سے بندگی کے آداب بھی بجالاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس حقیقت کی خبر ان الفاظ میں دی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ

اے مخاطب! کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے وہ سب عاجزی کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور سورج اور چاند ستارے اور پہاڑ درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی بھی اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو گیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ

اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ کی حمد نہ کرتی ہو اور اس کی پاکی نہ

تسبیح و حمد بیان کرتی ہو۔ مگر یہ کہ تم ان کی تسبیح اور زبان کو نہیں سمجھتے۔
علیٰ ہذا اگر اس تذلل و خضوع اور تواضع و پستی کا اظہار عظمت لیے نہایت اور آخری بڑائی کے سامنے نہ ہو بلکہ ہر کہ ومہ کے آگے جبہہ سائی کی جائے یا ہر منفعت و مفاد کے آگے پیشانی جھکا دی جائے تو یہ بھی اصطلاحی عبادت کہلانے کی مستحق نہیں ہو کیونکہ انسان جملہ مخلوقات میں خود ہی افضل و برتر ہے۔ اب اللہ کے سوا جس مخلوق کے آگے بھی انسان سر جھکائے گا وہ لامحالہ انسان سے کمتر ہوگی اور عبادت و بندگی اصل میں عظمت و کبریائی کے قدموں پر تذلل و پستی کے اظہار کا نام ہے۔ نہ کہ پستی کے قدموں پر عظمت و کبریائی کو بھینٹ چڑھانے کا۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
جب جھکا تو غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

عبادت کے مذکورہ بالا تین اجزاء ترکیبی کی تفصیل و تشریح سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دنیا کی جس قوم اور جس ملت میں سر کو زمین میں ٹیکنے اور سجدہ کرنے کی بندگی نہیں ہے۔ وہ عبادت کی حقیقت اور اس کی روح سے بالکل ناآشنا اور محروم ہے اور اس کو حق نہیں ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کے دین میں بھی عبادت ہے۔ یہ شرف اور فضیلت بھی صرف دین اسلام اور ملت محمدیہ کو حاصل ہے کہ اس نے نماز کے ذریعہ دنیا کے انسانوں کو عبادت کی روح اور اس کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ اسلام کی تمام عبادات میں یوں تو ہر عبادت، عبادت ہی کہلاتی ہے۔ مگر آخری تذلل و خضوع اور انتہائی پستی کا جو مظاہرہ نماز میں ہے وہ دوسری عبادتوں میں نہیں ہے۔ گویا عبادت خداوندی کا حقیقی مظہر اور

مفہوم بندگی کا صحیح مصداق صرف نماز ہے اور نماز کے جملہ ارکان واجزا میں روح نماز سجدہ ہے۔ اسی لئے حالت سجود میں بندہ کا جو قرب اور مقام مقبولیت نصیب ہوتا ہے وہ اسلام کی کسی دوسری عبادت یا کسی دوسری حالت میں نہیں ہوتا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی بندہ سجدہ کرتا ہے تو بندہ کا سر اللہ کے قدموں میں رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ایک نادیدہ نگر واقف و آشنا عاشق کے لئے اس سے زیادہ قرب کا اور کیا تصور ہو سکتا ہے کہ محبوب حقیقی نے اپنی چوکھٹ اور اپنے آستانے پر نہیں بلکہ خاص اپنے قدموں پر ہمارے سروں کو جگہ دی۔ کسی شاعر نے قدمبوسی کی اس لذت کو خوب بیان کیا ہے ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ حضرت! سجدہ کے شرائط کیا ہیں؟ شیخ نے جواب میں کہا کہ ہمارے لئے یا تمہارے لئے؟ سائل نے عرض کیا کہ سجدہ اور اس کے شرائط سب کے لئے یکساں ہیں۔ شیخ نے فرمایا نہیں ایسا نہیں ہے۔ اہل ظاہر کا سجدہ اور ہے اور حضرات صوفیائے کرام و عارفین کا سجدہ اور ہے۔ تمہارے سجدے کے شرائط یہ ہیں کہ پیشانی اور ناک کا نرم حصہ زمین پر ٹک جائے تو سجدہ صحیح ہو جاتا ہے مگر اہل معرفت اور صاحب حقیقت لوگوں کا سجدہ یہ ہے کہ جب سجدہ میں جائے تو جان دے کر واصل بحق ہوئے بغیر زمین سے سر نہ اٹھائے کیونکہ اللہ کے قدموں میں سے اپنا سر اٹھا لینا تقرب الٰہی کے ساتھ ناقدری و ناقدر شناسی کا برتاؤ ہے۔ اور جان دے دینا

اس انعام کا حقیقی شکر یہ ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ؎

آں سجدہ کہ تن نہ ز سرے شود جدا
در کشور وفا گنہش نام کردہ اند

سجدہ کی اسی خصوصیت کی بناء پر حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر نفل نماز جو کھڑے ہو کر پڑھی جائے اس کا ثواب پورا ہے اور جو نفل نماز بیٹھ کر پڑھی جائے اس کا ثواب نصف ہے کیونکہ حالتِ قیام سے سجدہ میں جانا پورا سجدہ ہے اور بیٹھے بیٹھے سجدہ میں چلے جانا نامکمل اور آدھا سجدہ ہے۔ سجدہ میں حاصل ہونے والے تقرب الٰہی اور مقام قرب کے پیش نظر نماز کو مؤمن کی معراج کہا گیا ہے "الصلوٰۃ معراج المؤمنین" نماز مؤمنین کی معراج ہے۔

گویا جس طرح معراج میں قربِ حق کے وہ تمام مقامات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئے جو سید الرسل اور امام الانبیاء کے لئے ممکن تھے اسی طرح نماز میں بندہ کو قرب کے وہ تمام درجات مل جاتے ہیں جو ایک مؤمن کے لئے ممکن ہیں۔ پس نبی کے انتہائی قرب کا نام معراج ہے اور مؤمن کے انتہائی قرب کا نام نماز ہے ؎

در بدن داری اگر سوز حیات
ہست معراج مسلماں در صلوٰۃ

حاصل یہ کہ حقیقتِ عبادت غایت تذلل ہے اور غایت تذلل کا مظہر سجدہ ہے۔ لہٰذا حقیقی عبادت نماز ہے اور باقی دوسری عبادات کو تعمیل حکم کے معنی میں عبادت کہا جاتا ہے۔ پس جس ملت میں نماز مع سجدہ کی عبادت نہیں ہے اس میں گویا سرے سے عبادت ہی نہیں ؎

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

لفظ عبادت کی اصطلاحی تشریح اور اس کے شرعی معنی سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ عبادت صرف الٰہی فرماں برداری اور اطاعت کو کہا جائے گا جو ارادہ و اختیار سے کی جائے۔ اور جس کی تلقین قرآن و سنت میں کی گئی ہے۔ اور جس فرماں برداری و تعمیل حکم میں ارادہ و اختیار کا مطلق دخل نہ ہو۔ بلکہ حکم کی بجا آوری غیر ارادی و جبری طور پر ہو تو وہ نہ لفظ عبادت کا مصداق ہے اور نہ شریعت اسلامیہ کا مقصود۔ جیسے، چاند، سورج، بادل اور ہوا کہ یہ سب کے سب اللہ کے مقررہ احکام کی بجا آوری اور تعمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر وہ تعمیل ارادہ و اختیار یا مرضی سے نہیں ہے بلکہ سب کے سب اللہ کے قائم کردہ نظام قدرت میں جکڑے ہوئے اور مجبور ہیں اور ان کو سر مو بھی خلاف ورزی کی قدرت نہیں ہے۔

آفتاب و ماہتاب اور جملہ کواکب اگر سب مل کر چاہیں کہ اپنی ضو فشانی اور نور پاشی کو روک لیں تو انہیں ہرگز اس کی قدرت حاصل نہیں ہے۔ درخت اگر چاہیں کہ لیٹ جائیں یا دریا اگر چاہیں کہ تھم جائیں تو یہ کام ان کے اختیار سے باہر ہیں۔

اس تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ حق تعالے نے اس کائنات میں دو نظام قائم فرمائے ہیں۔ ایک تکوینی۔ دوسرا تشریعی۔ انکی دوسری تعبیر نظام قدرت۔ اور نظام شریعت کے عنوان سے بھی کی جا سکتی ہے۔ عالم تکوین یا نظام قدرت سے اللہ کا وہ نظام مراد ہے جس کا تعلق کائنات کے انتظامی امور اور آسمان و زمین کے نظام و انصرام سے ہے۔ جیسے پیدائش اور موت، بارش برسانا اور ہوا چلانا، قحط سالی اور رزق رسانی، بیماری اور شفایابی وغیرہ وغیرہ قدرت الٰہی کا

یہ کارخانہ اور مشیت خداوندی کا یہ انتظامی عالم اللہ کے حکم اور ملائکہ اللہ کی وساطت اور ان کی خدمت گذاری سے چل رہا ہے ہر ہر کام پر فرشتے مامور ہیں اور انتظامات عالم سے متعلق فرامین خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں اور اس انتظامی و تکوینی نظام میں کائنات ارضی و سماوی کا ذرہ ذرہ حتیٰ کہ انسان بھی اس طرح جکڑا ہوا اور پابند ہے کہ اس کے ہر ایما اور ہر حکم پر پیروی و اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے ع

این جا جز این کہ جاں بسپارند چارہ نیست

ہم نہ موت کو ٹال سکتے ہیں اور نہ حیات کو رد کر سکتے ہیں۔ نہ ہوا پر اختیار رہے نہ بادل پر۔ نہ مرض پر قدرت ہے نہ شفا پر۔ اللہ کی طرف سے جس حالت وکیفیت کا اظہار ہو جائے ہم سب اس کی اطاعت پر مجبور ہیں لیکن مجبوری کی یہ اطاعت نہ اصطلاحی عبادت ہے اور نہ شریعت اسلامیہ کی غرض و غایت۔

اور تشریعی عالم یا نظام شریعت سے وہ نظام خداوندی مراد ہے جس کا تعلق اللہ کے ان جائز و ناجائز، حلال و حرام اور مرضی و نامرضی والے احکام شرع سے ہے جن کی تعمیل و عدم تعمیل اور فرماں برداری و نافرمانی میں ارادہ و اختیار کو دخل ہے۔ اور جن کی تعلیم و تلقین کے لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات اور حقوق اللہ و حقوق العباد وغیرہ۔ پس ملائکہ اور فرشتے کائنات کے انتظامی امور میں اللہ کے فرستادہ اور قاصد ہیں اور انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام عقل و فکر، عقائد و اعمال اور اخلاق و کردار کی خدائی قدریں اور الٰہی حدود بتلاتے بلکہ ان حدود کی مطابق

تربیت دینے کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ جیسا کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تشریف آوری کے بارے میں فرمایا۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ میں دنیا میں صرف اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل اور اتمام کر دوں۔

پندرہویں پارے کے آخر میں اور سولہویں پارے کے شروع میں حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو واقعہ بیان فرمایا ہے اس سے تکوینی و تشریعی اور انتظامی و شرعی امور کا فرق نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

کسی شخص نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا کہ آپ سے زیادہ علم والا بھی کوئی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جواب دیا کہ میرے علم میں مجھ سے زیادہ علم والا کوئی نہیں ہے۔ اور یہ بات حقیقت کے عین مطابق تھی کیونکہ اللہ کے بعد روئے زمین پر نبی اور پیغمبر سے بڑا کوئی عالم نہیں ہوتا مگر حق تعالیٰ کو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ جواب اس طرز سے پسند نہ آیا ؎

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا کہ آپ ہمارے ایک ایسے بندے کے پاس جائیں جس کو ہم نے ایسا مخصوص علم دیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے اور وہ حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ جن کے علم کے بارے میں قرآن کریم کی شہادت ہے۔

اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ہم نے اسے اپنے پاس سے رحمت

وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (نبوت یا ولایت) دی تھی اور اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت خضر علیہ السلام سے ملے اور کہا۔

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا کیا میں آپ کے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ آپ مجھے اس علم میں سے کچھ سکھائیں جو اللہ نے آپکو دیا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ شوق سے میرے ساتھ رہیں۔ مگر آپ میرے کاموں کو برداشت نہیں کرسکیں گے کیونکہ آپ کے پاس حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا علم ہے اور میرے سپرد انتظامی اور تکوینی امور ہیں۔ جن کا حلال و حرام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی طرف سے یقین دلایا کہ میں انشاء اللہ ہر چیز برداشت کروں گا، اور کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو گی چنانچہ باہمی اطمینان کے ساتھ یہ دونوں حضرات چل پڑے۔ دریا کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کھڑی تھی۔ کشتی والوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور دونوں کو کشتی میں بٹھا لیا۔ حضرت خضر علیہ السلام اٹھے اور کشتی میں سے ایک تختہ توڑ کر نکال دیا۔ اور وہ کشتی عیب دار ہو گئی، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس فعل کو شرعی معاملات و تشریعی اصول کے خلاف سمجھا۔ کیونکہ کشتی والوں نے مفت کشتی میں بٹھایا ہے تو احسان کا بدلہ احسان سے ہونا چاہیئے۔ نہ یہ کہ کشتی کو عیب دار کر کے ان کے ساتھ بدسلوکی اور بدخواہی کی جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا۔
لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا۔ یہ تو آپ نے بڑی عجیب سی بات کہی
حضرت خضر علیہ السلام نے کہا دیکھئے جو کچھ میں نے کہا تھا وہی ہوا کہ آپ صبر نہ کر سکے۔ اور انتظامی اور تکوینی امور کو تشریعی ضابطۂ اخلاق کی کسوٹی پر پرکھنے لگے۔
حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بھول چوک کی معذرت چاہی اور پھر دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے۔ ایک بستی اور گاؤں میں پہنچے جہاں چھوٹے بچے گلی میں کھیل رہے تھے حضرت خضر علیہ السلام آگے کو بڑھے اور ایک معصوم بچے کو جان سے مار ڈالا۔ حضرت موسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جن کی نظر شریعت کے ضابطہ اور قانون پر ہے بڑے بے چین ہو گئے اور فرمانے لگے۔

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَکِیَّۃً بِغَیْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُکْرًا۔ آپ نے تو ایک بے گناہ شخص کو ناحق بغیر قصاص کے مار ڈالا، یہ تو آپ نے بڑی بُری بات کی ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے پھر وہی بات یاد دلائی کہ مجھے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ آپ کے پیش نگاہ شریعت کے قوانین اور ضابطے ہوں گے جن کی تلقین آپ انسانوں کو فرماتے ہیں اور انسان اپنی بہبودی سمجھ کر اپنے اختیار اور ارادہ سے ان کی پیروی کرتے ہیں اور میرے پیش نظر اللہ کے وہ تکوینی اور انتظامی کام ہیں جن میں ضابطہ و قانون کا دخل نہیں ہے۔ بلکہ وہ خاص خاص مصلحتوں کی بناء پر صرف خدائی احکام کی تعمیل ہے اور جن کی پیروی میں کائنات کا ذرہ ذرہ پابند اور مجبور ہے۔ حضرت موسیٰ

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اس فرق کا اندازہ لگا لیا اور طے کر لیا کہ اب اس ناموافقت سے علیحدگی بہتر ہوگی۔

چنانچہ فرمایا کہ اچھا اس کے بعد اگر میں کوئی مداخلت کروں تو پھر آپ کو علیحدگی کا حق ہوگا۔ یہ دونوں حضرات پھر روانہ ہوئے اور ایک اجنبی اور غیر متعارف بستی میں پہنچے جہاں ان حضرات کو کوئی جانتا نہ تھا اور انہیں گذارہ کیلئے کسی سبیل اور کام کی تلاش بھی تھی، اہل بستی سے ان دونوں حضرات نے مہمانداری کی خواہش کی مگر انہوں نے ان کو مہمان رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس بستی میں ایک مکان کی دیوار اس درجہ جھکی ہوئی تھی کہ وہ گرنے والی تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے اپنی کمر سے بطور کرامت سیدھا کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہی کام آپ اجرت اور مزدوری سے انجام دیتے تو گذارہ کا انتظام بھی ہو جاتا، مگر آپ نے بلا اجرت ہی دیوار کو سیدھا کر دیا۔

لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا۔ — اگر آپ چاہتے تو اس پر معاوضہ بھی لے سکتے تھے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے علیحدگی اور جدائی کا اعلان کر دیا اور فرمایا کہ جدائی سے پہلے ان تینوں واقعات کی تکوینی اور انتظامی مصلحتیں سنتے جائیے۔ جن پر آپ نے اعتراضات کیے ہیں تاکہ دونوں کے مابین بدگمانی بھی باقی نہ رہ جائے اور آپ کو اپنے اور میرے علم کا فرق بھی معلوم ہو جائے۔ چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ان تینوں اقدامات کی تفصیل وار وجوہ اور مصلحتیں بیان فرمائیں اور فرمایا۔

وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي — ان میں سے کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔

ذٰلِكَ تَأْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا — (بلکہ خدا کے حکم کو بجا لایا) لیجئے یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔

حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام کی جدائی اور علیحدگی سے پہلے ترتیب وار ان واقعات کی حقیقت اور وجہ بیان فرماتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام کے ساتھ پیش آئے کشتی کا تختہ اکھاڑ دینے اور اس کو عیب دار کر دینے کے سلسلہ میں فرمایا۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا — بہر حال کشتی سو وہ چند مسکینوں کی تھی جس کے ذریعے وہ دریا میں کاروبار کرتے تھے، پس میرا مقصد یہ تھا کہ میں اسے عیب دار بنا دوں اور ان سے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر گذرنے والی صحیح و سالم کشتی کو غضب کر لیتا تھا۔

یعنی حضرت خضر علیہ السلام کشتی کو عیب دار بنانے والے واقعہ کی حقیقت اور اس کا پس منظر بیان فرما رہے ہیں کہ اصل بات یہ تھی کہ وہ کشتی چند غریب اور نادار لوگوں کی تھی جس سے وہ اپنی روزی کماتے اور گذارہ کرتے تھے اور آگے ایک ایسا ظالم بادشاہ تھا جو ہر گذرنے والی بے عیب کشتی کو غضب کر کے اپنے قبضہ میں لے لیتا تھا، اور منشائے خداوندی یہ تھا کہ مسکینوں کی اس کشتی کو اس ظالم سے بچا لیا جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں کشتی کا ایک تختہ نکال کر اسے عیب دار بنا دوں تاکہ وہ ظالم بادشاہ اس کشتی پر قبضہ نہ کرے۔

لہٰذا میں نے خدا کے حکم کی تعمیل کی اور اس طرح مسکینوں کی اس

کشتی کو بچا لیا۔ یہ بات اللہ کے تکوینی نظام اور انتظام عالم سے متعلق ہے جس کی حکمتیں اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور نہ اس میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کو کوئی دخل ہے۔ اور معصوم بچے کی ہلاکت کا وہ دوسرا واقعہ جس پر آپ نے اعتراض کیا تھا، اسکی حقیقت بھی یہ تھی۔ جس کو حق تعالےٰ ان الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا۔ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا

اور رہا وہ لڑکا سو اس کے ماں باپ مومن تھے سو ہم کو اندیشہ (یعنی تحقیق ہوا) کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر ڈالے گا، پس ہم کو یہ منظور ہوا کہ اس کے بجائے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے جو پاکیزگی یعنی دین میں اس سے بہتر ہو اور ماں باپ سے محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو۔

یعنی دوسرے واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ معصوم بچہ جسکو میں نے اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا وہ ایسے ماں باپ کا تھا جو پکے مومن اور مخلص مسلمان تھے اور خدا و رسول کی محبت سے ان دونوں کے دل لبریز تھے۔ جب ان کے گھر میں یہ بچہ تولد ہوا تو رفتہ رفتہ ماں باپ کے دل اس بچے کی محبت کی طرف اس درجہ مائل ہو گئے کہ اللہ و رسول کی محبت میں بھی کمی آ گئی اور دین پر عمل کرنے میں کوتاہی کرنے لگے یہاں تک کہ بچہ کی محبت اور اللہ و رسول سے غفلت اور لاپرواہی سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں بالکل ایمان سے ہی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں اور اللہ تعالےٰ ان کے ایمان بلکہ کمال ایمان کو برقرار اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے اس لئے حق تعالےٰ نے تکوینی اور انتظامی سلسلہ میں

یہ حکم دیا کہ ماں باپ کے ایمانی خطرے کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور اس بچے کو ہلاک کر دیا جائے۔ اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ ان دونوں کو اور اولاد عطا فرمائیں گے جو دینداری میں بھی اس سے بہتر ہوگی اور ماں باپ کے ساتھ محبت اور تعلق برتنے میں بھی اس لڑکے سے اچھی اور بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ چنانچہ میں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کی اور بچہ کو ہلاک کر دیا۔

اللہ کے اس تکوینی حکم کا مقصد اور اس کی حکمت درحقیقت ماں باپ کے ایمان کو بچانا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس انتظامی حکم کی تعمیل کو نہ ہمیں برا کہنے کا حق ہے اور نہ ناجائز و حرام قرار دینے کا۔

اور دیوار کو سیدھا کرنے کا وہ تیسرا واقعہ جس پر ہم دونوں نے جدائی اختیار کی ہے اس کی تکوینی حقیقت یہ ہے کہ ایک بستی میں اللہ کا ایک صالح و مقبول اور خاص بندہ رہتا تھا۔ جس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جو صالح باپ کے انتقال سے یتیم ہو گئے تھے۔

حق تعالیٰ نے نیک اور صالح باپ کے متروکہ خزانے کو لوگوں کے ذریعے ایک دیوار کے نیچے بطور دفینہ کے محفوظ کرا دیا تھا تاکہ دوسروں کی خرد برد سے بچ جائے اور بالغ ہونے پر بچوں کے کام آ سکے۔ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس تیسرے واقعہ کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ	اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں رہتے تھے اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ

أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا	مال مدفون تھا جو ان کے باپ سے میراث میں پہنچا تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچیں اور اپنے

دفینہ کو نکال لیں۔ اور ان میں سے کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ صبر نہ کر سکے

آخر میں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ وہ حقائق اور تکوینی حکمتیں ہیں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ اور شرعی اصول کے لحاظ سے اعتراض کرنے پر مجبور ہوئے۔

پس حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے ان واقعات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اللہ کا قائم کیا ہوا ایک انتظامی اور تکوینی نظام ہے جس کی پیروی اور فرمانبرداری میں کائنات کا ذرہ ذرہ مجبور ہے اور کسی میں سرتابی اور حکم عدولی کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن اس پیروی اور تابعداری کا نام عبادت نہیں ہے۔

اور دوسرا انتظام جو حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے۔ وہ تشریعی اور تعمیرانہ نظام ہے جس کے احکام کی پیروی میں بندے کے ارادے اور اختیار کو دخل ہے۔

مذکورہ بالا تشریح کے مطابق ایک درخت جو حکم خداوندی کی تعمیل میں سر و قد کھڑا ہے وہ اپنی پوری تعمیل حکم کے باوجود عابد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے کھڑے ہونے میں اس کے

ارادے اور اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے جس طرح ایک مادرزاد نابینا اگر اس بنیاد پر اپنے آپ کو متقی اور پرہیزگار کہے کہ میں نے کبھی کسی نامحرم پر بری نگاہ نہیں ڈالی تو اس کا یہ دعویٰ بے وزن اور غلط ہے کیونکہ بصارت اور بینائی نہ ہونے کی وجہ سے اگر یہ کسی پر بری نگاہ ڈالنا بھی چاہتا تو نہیں ڈال سکتا تھا۔ البتہ بصارت اور بینائی والا انسان خدا اور رسول کی ممانعت کی بنیاد پر اگر اپنے آپ کو بری نگاہ سے محفوظ رکھتا ہے تو یہ تقویٰ بھی ہے۔ اور طاعت و عبادت بھی۔

پس کسی شخص کو تکوینی نظام کی پیروی پر یہ تکیہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم پہلے ہی سے خدا کے عابد ہیں اور تکوینی نظام کے تمام احکام کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ تکوینی نظام کی پیروی میں ہم مجبور ہیں۔ اور تشریعی نظام کے احکام کی تعمیل میں ہمارے اختیار اور ارادے کو دخل ہے۔ اسی نظام کی پیروی کا نام عبادت اور بندگی ہے اور اسی نظامِ تشریعی کو قائم کرنے کے لئے دنیا میں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھیجے گئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ	اور ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لئے خالص رکھیں

حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مذکورہ بالا واقعہ سے اور گذشتہ تشریحات سے یہ بات ثابت ہوگئی۔ کہ تکوینی اور انتظامی عالم کے احکام کی پیروی کا نام عبادت اور بندگی نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی پیروی کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ مجبور اور پابند ہے

اس میں انسان کی کوئی خصوصیت نہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تذلل اور خضوع کا آخری اور انتہائی درجہ جب تک اختیار نہ کیا جائے اس وقت تک وہ بھی بندگی اور عبادت کہلانے کا مستحق نہیں

شریعت کی اصطلاحی عبادت کے تین اجزائے ترکیبی میں سے دو اجزا یعنی عمل عبادت اور عابد کا مفہوم کافی وضاحت کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے۔ البتہ تیسرا جز یعنی معبود کی تعیین اور اس کے مصداق کی وضاحت ابھی باقی ہے۔

چنانچہ عبادت جس کا مفہوم غایت عظمت کے سامنے انتہائی تذلل کا اظہار ہے اس سے یہ بات بھی متعین ہو جاتی ہے کہ معبود صرف وہی ذات اور ہستی ہو سکتی ہے جس کی عظمت اور بڑائی کے بعد عظمت اور بڑائی کا کوئی درجہ متصور اور موجود نہ ہو اور وہ صرف اللہ ہے۔ جس کی غایت عظمت اور شانِ کبریائی کا اظہار قرآن کریم میں ان الفاظ سے کیا گیا ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ — اور اسی کیلئے مخصوص ہے عظمت اور بڑائی آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

بعض حقیقت شناس اور علمار عارفین نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ "وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" والے جملہ میں اللہ کی شان: عظمت و کبریائی ہے۔ اور "وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" میں عظمت و کبریائی دیکھنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے یعنی آسمان و زمین میں اگر اللہ کی عظمت و کبریائی کو دیکھنا چاہو تو اللہ کی قدرت و اختیار اور غلبہ کو دیکھو کہ آسمان و زمین دونوں پر اس کی قدرت و حکومت اور اس کا قبضہ ہے اور مخلوقات عالم

میں اس کی حکمت اور دانائی کو دیکھو کہ کس طرح ہر ہر چیز میں بے پناہ حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ گویا کہ اللہ کی قدرت اور مصنوعات عالم کی حکمت دو آنکھیں یا دو چشمے ہیں۔ جن سے اللہ کی عظمت و کبریائی آنکھوں سے مشاہدہ ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا	کیا منافقین غیر اللہ کے پاس عزت چاہتے ہیں؟ سو بلاشبہ عزت تو ساری اللہ کے قبضہ میں ہے

پھر دنیا میں جب ایک انسان دوسرے انسان کی پیروی یا تابعداری کرتا ہے تو اصولی اور بنیادی طور پر اس کے تین وجوہ اور اسباب ہیں۔ ایک وجہ حسن اور جمال ہے دوسری وجہ ہنر اور کمال ہے اور تیسری وجہ احسان اور نوال ہے چنانچہ ایک عاشق اور مفتون اپنے محبوب کے حسن و جمال اور خوبصورتی کی وجہ سے اس کی پیروی اور تابعداری کرنے پر مجبور رہے یہاں تک کہ عاشق کی پیروی میں موزوں غیر موزوں اور مناسب اور نامناسب کا شعور بھی نہیں باقی رہتا ع

بدر دو صاف ترا حکم نیست دم درکش

کی سچی تصویر اور نمونہ بن جاتا ہے۔ کسی شاعر نے عشق کے ہاتھوں مجبوری کا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

محبت میں مر مر کے جینا پڑے گا
کوئی زہر دے گا تو پینا پڑے گا۔

اسی طرح کبھی انسان کسی کے ہنر اور کمال کی وجہ سے بھی صاحب کمال کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اس کی فرمانبرداری

کرتا ہے۔ پس ہر ناقص کامل کی اور ہر بے ہنر باکمال کی پیروی اس لئے کرتاہے کہ خوبی اور کمال نے اس کے دل پر قبضہ کرلیاہے نیز اطاعت و پیروی کے اسباب میں سے ایک بڑا اور مؤثر سبب انعام اور احسان بھی ہے۔ پس ہر شریف النفس احسان مند اپنے محسن کی اور ہر نیاز مند اپنے منعم کی حکم برداری اور پیروی اس لئے کرتاہے کہ محسن کے حسنِ سلوک اور احسان نے اس کے دل کو مسخر کرلیا ہے۔ عربی کا ایک شاعر حسن سلوک اور احسان کی تاثیر کو بیان کرتا ہے ؎

إِذَا أَنْتَ أَحْسَنْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهٗ
وَإِنْ أَنْتَ أَحْسَنْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تو کسی شریف طبع انسان کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرے گا تو تو اس کے دل کا مالک ہو جائے گا۔ اور وہ تیرا غلام ہو جائے گا۔ لیکن اگر تو کسی کمینے اور بد طینت انسان کے ساتھ احسان کرے گا تو وہ اپنی ذلیل فطرت کی وجہ سے اور زیادہ سرکش ہو جائے گا۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسانوں میں کسی کی اطاعت و پیروی پر مجبور کرنے کے یہی تین اسباب ہیں، اب غور طلب یہ بات ہے کہ دنیا کی کسی چیز کا حسن اور خوبصورتی خانہ زاد اور اپنی نہیں ہے بلکہ اللہ کی عطا کردہ اور مستعار ہے اسی اسی طرح دنیا کے تمام کمالات اور خوبیاں حق تعالیٰ کے حقیقی کمالات کا پرتو اور عکس ہیں۔ نیز دنیا میں احسان و انعام کی بڑی سے بڑی مثال بھی حق تعالےٰ کی صفت ربوبیت اور اس کی شان کریمی کا عکس ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا تینوں اسباب میں سے ہر ایک سبب عمر بھر اللہ کا غلام بنانے کے لئے کافی ہے۔ تو اگر یہ تینوں

اسباب اور وہ بھی حقیقی طور پر اللہ کی ذات واحد میں جلوہ گر اور نمایاں ہوں تو کیا اللہ پر عظمت و کبریائی اور کمال کے تمام درجے ختم نہیں ہو جاتے؟ اور جس ذات پاک پر عظمت و کبریائی کے تمام درجے ختم ہو جائیں کیا اس کے سوا کسی کی بندگی اور عبادت معقول اور برمحل قرار دی جا سکتی ہے؟ اور کیا اس کی شان یکتائی میں گھٹیا اور حقیر چیزوں کو شریک ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ اس لئے دنیا میں توحید سے زیادہ عقل کے مطابق اور روشن کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اور شرک سے زیادہ خلاف عقل اور بھونڈی کوئی بات نہیں ہو سکتی مگر اس کے باوجود غیروں کا نہیں اپنوں کا یہ حال ہے کہ زبانوں سے نعرہائے توحید بلند ہیں اور دلوں میں خدا جانے کتنے خود تراشیدہ بت گھسے بیٹھے ہیں ؂

مسلماں ہیں توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

پس یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ذات خداوندی کے سوا صحیح معنی میں نہ کوئی معبود ہے اور نہ اس کے سوا کسی کی بندگی عقلاً جائز اور روا ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ آسمان کے کواکب اور سیارات ہوں جیسے چاند، سورج اور دوسرے ستارے وغیرہ اور چاہے زمین کے عجائبات ہوں جیسے دریا، پہاڑ یا درخت اور جانور وغیرہ۔ کیونکہ ان معبودوں کی عظمت اور شان کا مقابلہ اللہ سے تو کیا ہوتا۔ یہ تمام چیزیں تو خود انسان کی عظمت کے مقابلہ میں بھی ہیچ در ہیچ ہیں۔ اللہ نے آسمان و زمین کی تمام مخلوقات کو انسان سے کمتر اور اس کا خدمت گار بنایا ہے۔ انسان نے اپنی بے عقلی اور بے بصیری سے خادم کو مخدوم اور غلام کو آقا بنا لیا ؂

كَانَ مَمْلُوكِي فَأَضْحَى مَالِكِي
إِنَّ هٰذَا مِنْ أَعَاجِيبِ الزَّمَنْ

یعنی میرا نوکر میرا مالک اور مخدوم بن بیٹھا، یہ بات زمانہ کے عجائبات میں سے ہے۔ غرض لفظ عبادت کے تینوں اجزائے ترکیبی یعنی عمل عبادت، عابد اور معبود کی تشریح سے اس عبادت اور بندگی کا مفہوم واضح ہو گیا، جس کیلئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لاتے رہے ہیں، اور جس عبادت و بندگی کا حکم قرآن و سنت میں دیا گیا ہے۔

لفظ عبادت کے سلسلے میں دوسری بحث یہ ہے کہ آیا یہ لفظ اطاعت کے ہم معنی ہے یا اس سے مختلف؟ کیونکہ قرآن و حدیث میں اللہ اور رسول دونوں کی پیروی کے لئے لفظ اطاعت استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا — اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو
الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ — اور اس کے رسول کا کہنا مانو اور تم میں سے
مِنْكُمْ۔ — جو لوگ حکم والے ہوں ان کا بھی۔

یا جس طرح حدیث میں آتا ہے "مَنْ أَطَاعَ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ"، سو اس سلسلے میں تحقیق یہ ہے کہ لفظ عبادت اور اس کا مفہوم حق تعالےٰ کے لئے مخصوص ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا، البتہ لفظ اطاعت کا استعمال عام ہے اللہ کے لئے بھی اور غیر اللہ کے لئے بھی، کیونکہ اطاعت کے معنی صرف اتباع اور پیروی کے ہیں اور عبادت کے مفہوم میں یہ بات بھی ملحوظ ہے کہ اس ذات کی پیروی کی جائے

جس کو ذاتی حیثیت سے امر کرنے اور حکم دینے کا حق ہو اور ظاہر ہے یہ حق سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں۔ حق تعالے نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (یعنی نیست سے ہست کرنا اور وجود دینا بھی اللہ کا کام ہے اور) امر اور حکم دینا بھی اللہ ہی کے لئے خاص ہے۔

پس اللہ کی فرمانبرداری عبادت ہے اور غیر اللہ کی پیروی صرف اطاعت ہے عبادت نہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع کر کے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔

یعنی اے لوگو اگر تم اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے تو آج ان کا وصال ہو گیا یعنی معبود رخصت ہو گئے اور عبادت بھی ختم ہو گئی۔ لیکن اگر تم عبادت اللہ کی کرتے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا راستہ اور طریقہ بتلانے کے لئے تشریف لائے تھے تو وہ اللہ اور معبود زندہ ہے۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ یعنی تمہاری عبادت اور بندگی کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اللہ کے احکام کی پیروی کو عبادت کہتے ہیں اور پیغمبر اور نبی کی پیروی کو اطاعت۔

شرعی اور اصطلاحی لفظ عبادت کے تینوں متعلقات یعنی عمل عبادت، عابد اور معبود کی تشریح کے بعد یہ امر بھی توجہ طلب ہے،

کہ اس عبادت کا مقصد، تاثیر اور غرض و غایت کیا ہے؟ سو اصل مقصد رضائے الٰہی اور حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے جو ہر عمل خیر اور نیکی کی غرض و غایت ہے لیکن وہ رضا اور خوشنودی نہیں جو ایک خوشامد پسند کو کسی کے تملق، چاپلوسی اور پستی کے اظہار سے ہوتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ اس قسم کے تمام تاثرات اور ایسی کیفیتوں سے پاک اور بری ہے جو دنائت فطرت اور ذلیل ذہنیت سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف بندہ کا تذلل اور اظہار پستی بھی تملق یا خوشامد نہیں ہے بلکہ اخذ فیض۔ اور حصول کمال کی خاطر اللہ کے سامنے جھکنا اور اس سے قریب ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ناقص اور عیب دار کامل و مکمل ہستی کی طرف اس لئے مائل ہوتا ہے کہ جوں جوں اس کی طرف جھکے گا اور قریب ہوگا اپنا نقص اور کھوٹ رفتہ رفتہ خوبی اور کمال سے تبدیل ہوتا چلا جائیگا۔ لیکن ناقص کے قریب ہونے سے کامل کے کمال اور خوبی میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ سرسری نظر اور ظاہر بیں نگاہوں میں سر کا زمین میں جھکا دینا ذلت اور پستی ہے لیکن حقیقت میں رفعت و بلندی ہے۔ اور غیرت و خودداری کے جذبات یہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔ سراپا کمال اور مجسم خوبی سے قریب ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس ایک ذات کے سوا ہر چیز نظروں سے گر جاتی ہے اور بڑے سے بڑے کامل کے سامنے بھی جھکتے ہوئے غیرت اور شرم آتی ہے ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور اس کے برخلاف جس نے حق تعالیٰ کی سراپا کمال ہستی کے سامنے سر نہیں جھکایا، اس کو ہر آستانے پر اپنی پیشانی رگڑنی پڑتی ہے اور در در کا بھکاری بننا پڑتا ہے ۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اسمیں ہے آفاق

بعض تذکرہ نویسوں نے شہزادہ علی حزیں کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے اپنے خدام میں ایک ایسا خادم مقرر کیا تھا جو شہزادہ علی حزیں سے شعر اور منظوم کلام میں بات کیا کرے ، اس خادم کا نام رمضانی تھا ، ایک مرتبہ علی حزیں کسی کام میں مصروف تھا کہ اس پر مکھیوں کا ہجوم ہو گیا بار بار اڑائے گے باوجود مکھیوں میں کمی نہ آئی ۔ علی حزیں نے اپنے خادم رمضانی سے منظوم انداز میں کہا ع

"رمضانی مگساں مے آیند"

یعنی اے رمضانی میرے پاس بہت سی مکھیاں آرہی ہیں رمضانی نے علی حزیں کا جواب دیتے ہوئے منظوم کلام میں کہا ع

ناکساں پیش کساں مے آیند

یعنی حضور مکھیوں سے پریشان نہ ہوں کیونکہ ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ ہر نااہل و نالائق اور ناقص اپنے نقص اور اپنی نالائقی کو دور کرنے کے لئے اہل کمال کے گرد جمع ہو جاتے ہیں مکھیوں کا ہجوم بھی آپ کے کمال کی نشانی ہے ۔ غرض یہ بات واضح ہے کہ ہر ناقص کسی کامل کی طرف تملق اور خوشامد کے لئے نہیں جھکتا ۔ بلکہ خود اپنے نقص اور اپنی کمزوری کو دور کرنے

کے لئے جھکتا ہے۔ اسی لئے مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

یعنی اللہ نے انسان کو پیدا کیا پھر بندگی کا حکم دیا تو اس سے اللہ کا اپنا کوئی فائدہ نہیں بلکہ خود بندے کا فائدہ مقصود ہے محققین علماء اور اہلِ معرفت حضرات نے لکھا ہے کہ فضیلت و ثواب اور قربِ خداوندی کے اعتبار سے عبادت کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ عبادت کا یہ ہے کہ ثواب کی امید یا عذاب کے ڈر سے اللہ کی عبادت اور بندگی کی جائے۔ حقیقت شناس اور بلند نظر اہلِ معرفت نے اس درجہ کو معمولی اور ادنیٰ درجہ اس لئے قرار دیا ہے کہ اس میں عابد کا مطمحِ نظر ثواب و عقاب ہے اور اس کی نظر اجر اور بدلہ پر ہے اللہ کی ذات پر نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اس میں خود غرضی کا شائبہ نظر آتا ہے۔ انتہائی اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ ثواب و عقاب کے تصور سے بھی اپنے آپ کو بلند رکھے۔

علامہ اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

عبادت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اس لئے اللہ کی عبادت اور بندگی کرے کہ اس کو عبدیت اور بندگی کا شرف حاصل ہو جائے اور وہ جملہ کمالات پیدا ہو جائیں جو عبادت و بندگی سے حاصل ہوا کرتے ہیں یہ درجہ پہلے درجے کی نسبت سے اعلیٰ ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں بھی عابد کی نظر اپنے مفاد اور اپنے ذاتی مقصد

پر ہے اور عبادت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ کی صرف اس لئے عبادت اور بندگی کی جائے کہ وہ اللہ اور معبود ہے اور ہم اس کے بندے اور مملوک ہیں معبود کی شان ہی یہ ہے کہ اس کی عبادت کیجائے اور بندے کی حیثیت ہی یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت اللہ کی عبادت اور بندگی کرے۔

رہا اجر وثواب یا حصول کمال سو یہ عبادت کا لازمی اثر اور قدرتی تاثیر ہے۔ جس کو مقصود بنانے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ چیزیں بلا مقصود بنائے بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

پس یہ عبادت کا سب سے اعلیٰ اور سب سے اونچا مقام ہے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ہیں انھوں نے حق تعالےٰ کو خواب میں دیکھا، حق تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ تم جو کچھ مانگنا چاہتے ہو مانگو، شاہ صاحب نے جواب میں عرض کیا یا اللہ اُرِیْدُ اِلَّا لَا اُرِیْدُ اے اللہ بس میں یہی چاہتا ہوں کہ کچھ نہیں چاہتا حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تو کچھ نہیں چاہتا تو اللہ کی عبادت اور بندگی کیوں کرتا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ میں اللہ کی بندگی اس لئے کرتا ہوں کہ میں بندہ ہوں اور بندے کا کام ہی عبادت اور بندگی ہے۔ پس میری بندگی کا مقصد اللہ کی معبودیت کی شان اور میری عبدیت کی حیثیت کے تقاضے سے ہے، کسی لالچ اور ڈر سے نہیں ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس جواب پر اللہ تعالےٰ نے وہ وہ روحانی نعمتیں عطا فرمائیں کہ نہ انسان کا دل و دماغ ان کا تصور کر سکتا ہے اور نہ انسانوں کی آنکھوں نے انھیں دیکھا ہے اسی طرح حضرت شیخ ابن الفارض رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے حالت نزع میں دیکھا کہ اللہ کی طرف سے ایسی جنت ان کے سامنے پیش کی گئی ہے جو تجلیات خداوندی سے خالی ہے اور اس میں ہر قسم کی نعمتیں موجود ہیں انہوں نے حالت نزع میں ادھر سے اپنا منہ پھیر لیا اور حسرت و یاس کے عالم میں یہ شعر پڑھا ؎

اِنْ کَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَکُمْ
مَا قَدْ رَاَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

یعنی اے اللہ اگر میری ساری عبادتوں کا صلہ یہی جنت ہے جس میں آپ کے دیدار اور آپ کی تجلیات کے سوا ہر قسم کی نعمتیں موجود ہیں تو میں نے گویا کہ اپنی تمام عمر ہی ضائع کر دی کیونکہ میری عبادتوں کا مقصد جنت کے میوے یا حور و غلمان نہ تھے۔ اور جو چیز مقصود تھی وہی اس جنت میں موجود نہیں ہے تو میں ایسی جنت کو لے کر کیا کروں گا،

حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اب ان کے سامنے ایسی جنت پیش کرو کہ جس میں اللہ کی تجلیات بھی موجود ہوں، چنانچہ پھر اللہ کی تجلی کو بھی دکھایا گیا۔ شیخ ابن الفارض دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اور اسی حالت میں ان کی روح قبض کر لی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں عبادت کا سب سے اعلیٰ درجہ اور مقام یہ ہے کہ انسان اپنی عبدیت کے احساس اور تقاضے سے اللہ کی عبادت اور بندگی کرے، رضائے الٰہی کے علاوہ باقی فوائد اور خاصیتیں خود بخود ہی حاصل ہو جاتی ہیں ان کا قصد اور ارادہ کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔

مفہوم عبادت کے تینوں متعلقات یعنی عمل عبادت عابد اور

معبود کی تشریح و تعیین مناسب حد تک حسب توفیق عرض کی گئی۔ اس مضمون کے تتمہ کے طور پر ایک چیز اور قابل بیان ہے جو گذشتہ مضامین کے اعتبار سے نتیجہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی مقام عبدیت" اور یہی وہ درجہ اور روحانی اعلیٰ مقام ہے جس کو انسانیت کی معراج اور نقطہ کمال کہا جائے تو اچھا ہے۔

یہ مقام رفیع انسان کو صرف عمل عبادت کی بجا آوری سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ مسلسل حق بندگی ادا کرنے اور اس پر دوام اور پابندی کرنے اور عابد کے خود اپنے عمل عبادت اور معبود کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جس قدر یہ معرفت ترقی کرتی جائے گی اس کے مناسب عبدیت کا مقام اور کیفیت روحانی حاصل ہوگی۔ اسی مقام عبدیت پر پہونچ جانے کے بعد انسان ذوق ایمانی اور کیفیت عبادت سے لطف اندوز ہوتا ہے اور غیر اللہ سے دل کی لو ہٹ کر صرف اللہ سے لولگ جاتی ہے اور دنیوی مصائب و آلام اور رنج و غم یا زائل ہو جائے قلب سے چھوٹ جاتے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم میں بڑی سے بڑی روحانی اذیتوں اور دل تنگیوں سے نجات کا طریقہ یہی بتایا گیا ہے کہ ایسے موقع پر بندہ مصیبتوں اور تکلیفوں سے گھبرانے کے بجائے خداوند رحیم و کریم کے حضور اس کی شان مالکیت و معبودیت اور اپنی عبدیت و بندگی کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرے۔

حق تعالے کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ اور ہم جانتے ہیں کہ بیشک آپ کا

صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُوْنَ	دل تنگ ہوتا ہے، انکی باتوں سے
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ	تو آپ اپنے پروردگار کی تسبیح
كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَ	کرتے اور اس کی خوبیاں بیان
اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ	کرتے رہیئے اور سجدہ کرنے والوں
الْيَقِيْنُ	میں داخل رہیئے اور اپنے پروردگار

کی عبادت کرتے رہیئے، یہاں تک کہ آپ کی موت کا وقت آجائے۔

اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ وظیفۂ عبادت اور فرائض بندگی بجا لانے میں تادمِ زیست کبھی خلل نہ آنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک عبد کی عبدیت، عبدیت کا شعور و احساس اور اس کے لوازم کی ادائیگی ہی اس کی اصل شان ہے۔ اسی طرح حق تعالےٰ کے اس ارشاد سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ قلب و روح کی اذیتیں اور دل تنگی عمل عبادت سے زائل ہو جاتی ہے اور حقوقِ عبدیت کو صحیح طور پر ادا کر کے قلب میں انشراح اور انبساط پیدا ہوتا ہے۔ غرض مقامِ عبدیت" وہ اعلیٰ مقام ہے جس سے اونچا کوئی مقام انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزۂ اسراء و معراج کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم میں حق تعالےٰ نے آپ کی ذاتِ اقدس کو نبی رسول یا کسی اور لقب سے تعبیر کرنے کے بجائے آپ کی عبدیت کو اپنی طرف نسبت فرما کر ذکر فرمایا۔

سُبْحٰنَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى	پاک ہے وہ ذات جو رات میں
بِعَبْدِهٖ	لے گئی اپنے بندے کو۔

اس سے معلوم ہوا کہ مقامِ نبوت، مقامِ رسالت اور آپ کے تمام بلند تر مقامات میں سے "مقامِ عبدیت" زیادہ اونچا اور زیادہ

باعث شرف مقام ہے اسی لئے آپ کی تعریف اور عظمت شان ظاہر کرنے کے موقع پر آپ کی عبدیت اور اللہ کا بندہ ہونے کی حیثیت کو ظاہر کرنے والا لفظ اختیار فرمایا گیا۔

محققین علماء نے لکھا ہے "عبداللہ" بہت سے لوگوں کا نام ہے اور بسا اوقات لفظ عبداللہ اپنے اضافی (اللہ کا بندہ) معنی میں بولا جاتا ہے۔ لیکن تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے لقب کے طور پر صرف آپ ہی کے لئے لفظ "عبداللہ" تجویز فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا — جب "عبداللہ" (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا — اس کی عبادت کرنے کھڑے ہوئے

تو قریب تھا کہ کفار ان کے گرد ہجوم کرنے لگتے۔

اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے ملوکیت و بادشاہت کے مقابلہ میں شان عبدیت کو پسند فرمایا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ کو اختیار دیا گیا کہ آپ چاہیں تو رسالت کے ساتھ بادشاہت کو پسند کریں جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے اور یا رسالت کے ساتھ عبدیت پسند فرمالیں۔ تو آپ نے عبدیت ہی کو پسند فرمایا ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز آرزومندی

مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

حتیٰ کہ آپ نشست و برخاست اور کھانے پینے کی وضع تک میں اس شان کا مظاہرہ فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ میں اس طرح بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔ جس طرح ایک غلام کھائے اور آپ کی اس پسندیدگی کے باعث

کلمۂ شہادت و غیرہ میں "عبدہٗ" کو "رسولہٗ" پر مقدم رکھا گیا ہے حتیٰ کہ ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے اس ترتیب کو بدل کر "رسولہٗ و عبدہٗ" کہہ دیا تو فوراً آپ نے ان کی اصلاح فرمائی کہ وہی "عبدہ و رسولہٗ" کہو۔

عارفین امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے بھی مقام عبدیت ہی کو اپنے لئے پسند فرمایا۔ اور اس کے لئے دعائیں کی ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک دعا کے الفاظ ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ وَجَدْتُکَ رَبًّا كَمَا اَرَدْتُ فَاجْعَلْنِیْ عَبْدًا كَمَا اَرَدْتَ"	اے اللہ میں نے آپ کو ایسا ہی رب پایا جیسا میں نے ارادہ کیا پس آپ بھی مجھے ایسا ہی بندہ بنا لیجئے جیسا آپ چاہتے ہیں

بعض علماء عارفین کی رائے یہ ہے کہ پیغمبر کے مقام نبوت و رسالت سے ان کا "مقام عبدیت" زیادہ اعلیٰ اور ارفع مقام ہوتا ہے، اس لئے کہ اس مقام میں آپ کی توجہ مخلوق سے خالق کی جانب ہوتی ہے۔ اور نبوت و رسالت میں توجہ مخلوق کی طرف ہوتی ہے۔ نیز اس لئے بھی نبی کے مقام عبدیت کو دوسرے تمام کمالات پر فضیلت ہوتی ہے کہ عبد کے معنی ہیں بندہ اور غلام تو جو شخص صرف اللہ کا بندہ اور اس کا کامل غلام بن جائے اس کی تمام حاجات اور ضروریات کی کفالت اور احوال کی اصلاح و درستی کی ذمہ داری مولائے حقیقی اور حق تعالےٰ اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ چنانچہ لفظ "عبد" خود مولا کی اس کفالت و ذمہ داری کی طرف اپنے مفہوم سے اشارہ کرتا ہے۔ تاہم مقام نبوت و رسالت اور مقام عبدیت میں ایک امتیازی فرق ہے کہ نبوت و رسالت کی صفت غیر نبی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی اور مقام عبدیت

انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے علاوہ دوسرے مومنین کو فرق مراتب کے ساتھ کامل درجے کے اتباع شریعت سے کسی حد تک حاصل ہو سکتا ہے اگرچہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور بڑے سے بڑے مومنین کاملین کے مقام عبدیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نبی کے مقام عبدیت کو دوسرا کوئی شخص نہ پہنچ سکتا ہے نہ اس کا تحمل کر سکتا ہے حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام عبدیت ایک سوئی کے ناکہ کی برابر مجھے منکشف ہوا تو میں اس کی بھی تاب نہ لا سکا۔ اور قریب تھا کہ میں جل کر خاک ہو جاتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں مومنین کاملین کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا	اور خداوند رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۔	اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے ان بندوں سے کہہ دیجئے جو ایمان لے آئے ہیں کہ وہ نماز کو قائم رکھیں اور اس دن کے آنے سے پہلے ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے در پردہ اور ظاہر

خرچ کرتے رہیں جس میں نہ اعمال کی خرید فروخت ہو سکے گی اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی۔

غرض عبد کا مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ اپنے آقا اور مولا کے سامنے عاجز و بے اختیار اور سراپا احتیاج ہو۔ اس لئے جن قلوب میں حق تعالے کے سامنے اپنی عاجزی و بے اختیاری اور ذلت و پستی کا شعور و احساس بیدار رہے ان کو مقام عبدیت حاصل ہے اور یہ شعور و احساس جس قدر زیادہ ہوگا۔ اسی قدر "مقام عبدیت" میں بھی ترقی ہوگی، حتیٰ کہ اگر کمالات خداوندی اور اس کی قدرت و اختیار کا شعور تام ہے تو مقام عبدیت بھی اسی مناسبت سے تام اور ارفع حاصل ہوگا۔ بلکہ اگر کمالات خداوندی اور اسکی قدرت کے مشاہدہ میں انسان اس درجہ غرق ہو جائے کہ اپنی ذات میں کسی کمال کے شعور کی کیفیت بھی باقی نہ رہے تو یہی عبدیت مطلقہ اور کمال عبدیت ہے اور یہی مقام عبدیت کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اسی "مقام عبدیت" اور کیفیت عبدیت کے اظہار کی طرف "ایاک نعبد" میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ — اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

بارگاہِ خداوندی میں بندہ کی طرف سے اپنی حیثیت اور درخواست دہندہ کے فدویانہ تعارف کا سلسلہ جاری ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ فدوی کا اصل تعارف ہے۔ اور "وَاِیَّاکَ نستعین" اس فدویانہ تعارف کی تکمیل ہے کہ اللہ کے حضور ہماری حیثیت ایک عاجز و درماندہ غلام کی ہے جس کا سب کچھ آقا کے لئے ہے۔ اور جس کا سر اطاعت ہر وقت آقا کے لئے جھکا ہوا ہے اور اطاعت و بندگی کا یہ کل سرمایہ بھی ہماری قوۃ و ہمت اور کوشش و تدبیر کا نتیجہ اور ثمرہ نہیں بلکہ یہ بھی اسی آقا کی دی ہوئی توفیق اور اس کی دست گیری و مدد کا صدقہ ہے ۵

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا

إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ " میں " إِيَّاكَ " سے بھی حق تعالیٰ کی ذاتِ گرامی مراد ہے اور اسی لئے از راہ تکریم " إِيَّاكَ " کو مقدم ذکر کیا گیا، نیز یہاں بھی " إِيَّاكَ نَعْبُدُ " کی طرح حصر اور تخصیص مقصود ہے۔ گویا ترجمہ یوں ہوگا۔ ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور تیرے سوا کسی سے مدد نہیں چاہتے۔

" نستعین " اصل میں " عون " سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں مدد اور توفیق۔ مفسرین نے لکھا ہے۔

الاستعانة طلب المعونة	استعانت کے معنی ہیں توفیق اور
وهي ازالة العجز والمساعدة	تائید مانگنا یعنی اتمام عمل کی راہ سے
على اتمام العمل الذى يعجز	رکاوٹ کو دور کرنا اور ایسے عمل
المستعين عن الاستقلال	کی تکمیل کی توفیق مانگنا جو بندہ

به بنفسه " خود اپنی تدبیروں سے انجام نہیں دے سکتا۔

گویا اعانت کا طلب گار راستے کی رکاوٹ کا ازالہ بھی مانگتا ہے اور اتمام کی توفیق بھی۔ اسی طرح اللہ کی معین اور مددگار ذاتِ گرامی راہِ عمل کے رخنوں کو دور کر کے بھی مدد کرتی ہے اور اسباب عمل میں ثمرہ اور نتیجہ پیدا کر کے بھی۔

یہاں اسباب و ثمرات اور علل و نتائج کے سلسلہ کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے تاکہ توفیق اور طلب توفیق کی حقیقت واضح ہو جائے۔

زمین و آسمان کی وسیع کائنات اور ثریٰ سے ثریا تک کے جملہ درمیانی عالم حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمائے اور

ان میں اسباب وعلل کا لامتناہی سلسلہ اور حکیمانہ نظام قائم فرما دیا۔ اسی لئے اس عالم کو عالم اسباب کہا جاتا ہے۔ اور یہاں ہر نتیجہ اور ہر تغیر کسی نہ کسی سبب اور علت سے وابستہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں اسباب وعلل کی حقیقت سمجھنے میں دو قسم کی لغزشیں ظہور میں آئی ہیں۔ بعض کوتاہ بیں اور سطحی نظر رکھنے والوں نے اسباب وعلل کو مؤثر حقیقی، موجد اور خالق سمجھ لیا ہے۔ گویا ان کی نظر میں قدرت واختیار کا اصل سرچشمہ یہی اسباب وعلل ہیں اور اس کے خلاف کو "قانونِ قدرت کی خلاف ورزی" جیسے مہمل اور بے معنی الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے عقل وفہم کی اس نارسائی کا پردہ اس طرح چاک کیا ہے ؎

عقل دراسباب مے دارد نظر
عشق مے گوید مسبب را نگر

یعنی عقل کی نارسائی یہ ہے کہ اس کی نظریں اسباب میں الجھ کے رہ گئیں۔ مگر عشق کی نگاہِ معرفت نے اسباب سے بلند ہو کر موجدِ علل اور اسباب کو پہچان لیا کہ کون وفساد کی قدرت اور وجود وعدم کے اختیار کا اصل سرچشمہ اسباب نہیں مسبب الاسباب ہے۔

اسباب وعلل کے سلسلہ میں دوسری لغزش یہ ہے کہ بعضوں نے انہیں بے اثر اور بیکار سمجھ کر بالکل نظر انداز کر دیا اور اسی کو توکل وتسلیم جیسے خوبصورت الفاظ سے تعبیر کرنے لگے حالانکہ اسباب وعلل کے سلسلہ کو نظر انداز کرنا نہ تو توکل وتسلیم ہے اور نہ معرفت وولایت۔ بلکہ اس حکیمانہ نظام اسباب کی خلاف ورزی اور توہین ہے۔ جس کے پردہ میں حق تعالیٰ نے

اپنے دستِ قدرت کو مستور فرمایا ہے۔

پھر عام طور پر اللہ کی سنت و عادت یہی ہے کہ نتیجہ کا ظہور بھی اسی وقت ہوتا ہے جب عوامل و اسباب عادیہ کو اختیار کیا جائے۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو پیغمبرانہ شانِ تسلیم و توکل رکھتے ہیں ظاہری اسباب کے لحاظ سے اپنے بیٹوں کو حکم دیا۔

وَقَالَ يَابَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میرے بیٹو! تم سب کے سب ایک ہی دروازہ سے مت جانا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے جانا۔ باقی خدا کے حکم کو میں تم پر نہیں ٹال سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے۔ اسی پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور متوکلوں کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

یعنی نظرِ بد وغیرہ سے بچنے کے لئے ظاہری تدبیر یہ ہے کہ ایک ساتھ داخل نہ ہوں باقی اصل توکل اللہ ہی پر ہے۔

بہرحال نظامِ علل اور سلسلۂ اسباب کو سمجھنے میں ان دونوں گروہوں نے غلطی کی ہے اور حق یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے جس طرح اسباب و علل کو وجود دیا ہے اسی طرح اسباب و علل کی تاثیر اور خواص کو بھی پیدا فرمایا۔ اور جس طرح اسباب و علل کا وجود اللہ کی مشیّت کے تابع ہے اسی طرح اسباب و علل کی تاثیر بھی اس کے ارادہ اور مشیّت کے تابع ہے۔ جب اللہ کی مشیّت

اور اس کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے تو تاثیر کا ظہور ہوتا ہے ورنہ نہیں
اسباب وعلل میں نہ اپنی ذاتی کوئی قدرت وتاثیر ہے اور نہ
اللہ نے اپنی قدرت اور اپنا اختیار اسباب وعلل کو منتقل کیا ہے
تاثیر اور ثمرہ نہ اسباب وعلل کے لئے لازم ہے اور نہ تاثیر وثمرہ
کے وجود میں اسباب وعلل کو حقیقی دخل ہے۔ اسی لئے
بارہا ایسا ہوتا ہے کہ اسباب وعلل اور دواعی وتدابیر سب موجود
ہیں۔ مگر نتیجہ غائب اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نتیجہ وثمرہ
موجود ہے مگر اسباب وعلل غائب۔ بعض ارباب تحقیق کا
ارشاد ہے۔

سُبْحَانَ مَنْ رَبَطَ الْاَسْبَابَ بِمُسَبَّبَاتِهَا لِيَهْتَدِيَ الْعَامِلُوْنَ وَخَرَقَ الْعَوَائِدَ لِيَتَفَطَّنَ الْعَارِفُوْنَ فَيَعْلَمُوْا اَنَّہٗ فَاعِلٌ مُخْتَارٌ

پاک ہے وہ ذات جس نے اسباب کو مسببات کے ساتھ مربوط فرمایا تاکہ کام کرنے والوں کو کام کا طریقہ معلوم ہو اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھیں۔ اور کبھی کبھی اسباب کو مسببات سے الگ کر دیا تاکہ
اہل معرفت اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ فاعل مختار وہی اللہ ہے۔

نظام عالم میں اسباب وعلل کی مثال بالکل ایسی ہے
جیسے ریلوے کے نظام میں گارڈ کی ہری اور لال جھنڈی کی
ہری جھنڈی کو حرکت دینے سے گاڑی چلتی نظر آتی ہے اور لال
جھنڈی کو دکھانے سے چلتی گاڑی کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر معمولی سے
معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے
کہ جھنڈی کو نہ گاڑی کے چلانے میں کوئی دخل ہے اور نہ روکنے
میں بلکہ ریلوے کے نظام میں ہری جھنڈی گاڑی کو چلانے کی

نشانی ہے اور لال جھنڈی گاڑی کو روکنے کی۔ باقی اس کا اصل چلانے والا اور روکنے والا کون ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ڈرائیور چلاتا ہے اور ڈرائیور ہی اس کو روکتا ہے۔

اسی لئے ہر کام اور ہر عمل کے لئے بندہ اتمام عمل اور ظہور نتیجہ کی دعا بھی کرتا ہے۔ جس کا دوسرا نام استعانت باللہ اور طلب توفیق ہے۔

استعانت جس کی حقیقت راہِ عمل کی مشکلات کا حل اور اتمام عمل کی توفیق مانگنا ہے قدرتی طور پر اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہونی چاہیئے، کیونکہ حل مشکلات اور اتمام عمل حق تعالیٰ ہی کی خصوصیت ہے۔ اور کسی دوسرے میں یہ وصف نہیں ہے۔ البتہ اسباب عادیہ کے ساتھ استعانت جیسے بھوک میں غذا سے، پیاس میں پانی سے، اور بیماری میں دوا اور طبیب سے مدد اور تعاون چاہنا اسلام میں جائز اور روا ہے کیونکہ عالم اسباب میں اللہ تعالے نے نتائج اور حقائق کے لئے اسباب کو ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہے اور اپنی مخصوص تاثیر کے لئے انہی اسباب و علل کو مظہر قرار دیا ہے پس غیراللہ سے استعانت کے جائز و ناجائز ہونے کا دارومدار اس پر ہے کہ مستعین کے ذہن میں غیر اللہ کی حیثیت اور اس کا مقام کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز نے استعانت کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص اللہ کے علاوہ جس سے اعانت اور مدد مانگ رہا ہے۔ اگر مستعین اس کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہے

کہ یہ غیر اللہ بذاتِ خود قادر اور اپنے عمل و فعل میں خود مختار اور مستقل ہے، تو بلا شبہ یہ ایسا کھلا اور واضح شرک ہے جس کے شرک ہونے میں شاید مشرک کو بھی شبہ نہ ہو۔ کیونکہ قدرت علی الاطلاق کے موقع پر بھی اللہ ہی کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ قرآن کریم میں حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

اور اگر آپ ان (مشرکین) سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو ضرور یہ لوگ بھی کہیں گے کہ اللہ نے۔

پس معلوم ہوا کہ خلق و تدبیر جیسے امور پر قدرت کے بارے میں مشرک بھی اللہ کو لا شریک لہٗ سمجھتے تھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مستعین اور بندہ غیر اللہ کو قادر علی الاطلاق اور مستقل بالذات نہیں سمجھتا بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ نے اپنی قدرت اور اپنا اختیار عام بالکل اسی طرح غیر کے حوالہ کر دیا ہے جس طرح کوئی خود مختار بادشاہ اپنے اختیارات وزراء اور عمالِ حکومت کو دیدیتا ہے اور پھر وہ وزراء بادشاہ کے علم و ارادہ کے بغیر خود ہی جس طرح چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں اور جس کو نہیں چاہتے نہیں دیتے۔ گویا کہ تفویض و عطا کے بعد تصرف میں مستقل اور خود مختار ہیں۔ استعانت کی یہ قسم بھی بالاتفاق ایسا شرک ہے جس کو قرآن کریم نے "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" سے تعبیر کیا ہے۔ مشرکین عرب ملائکہ اور اصنام کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے، قرآن کریم میں ارشاد ہے

فَاِنَّعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

ہم ان کو صرف اس لئے پوجتے ہیں ہمیں اللہ کی جانب قرب کے درجہ میں پہنچا دیں۔

معلوم ہوا کہ غیر اللہ کیلئے خواہ وہ انبیاء کرام و اولیاءِ عظام ہوں یا ملائکہ و جنات ہوں یا کواکب و اصنام ہوں یہ عقیدہ رکھنا کہ حق تعالےٰ نے ان کو قدرت و اختیار منتقل کر کے تصرف میں مستقل بالذات بنا دیا ہے۔ دین توحید کے خلاف اور کھلا ہوا شرک ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ جس غیر سے اعانت مانگی جائے اسکے بارے میں نہ مستقل بالذات ہونے کا عقیدہ ہو اور نہ مستقل بالعطا کا، لیکن معاملہ اور برتاؤ کا طریقہ ایسا ہو جس سے دوسروں کو مستقل بالذات ہونے کا عقیدہ محسوس ہوتا ہو جیسے ارواح سے مدد مانگنا یا قبروں کو سجدہ کرنا وغیرہ۔ اسلام میں اس طرح کی استعانت بھی سخت گناہ، حرام اور دین توحید کے خلاف ہے۔ علماء ربانیین نے لکھا ہے کہ استعانت کی پہلی دونوں صورتیں کھلا شرک ہیں جن کے عقیدے سے انسان مشرک و کافر کہلاتا ہے۔ اور تیسری صورت میں اعتقادی شرک اگرچہ نہیں ہے مگر یہ عملی شرک ہے جس سے اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ کہیں عقیدہ بھی متاثر نہ ہو جائے۔ اور یہ طریقہ دوسروں کے لئے گمراہی اور فساد عقیدہ کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تشریح سے یہ بات صاف ہو گئی کہ استعانت ذات باری کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی غیر اللہ سے استعانت جائز نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ اسباب عادیہ یا اسباب شرعیہ سے مدد لینا اور استعانت "ایاک نستعین" کے مفہوم اور اس کی روح کے منافی ہے یا عین مطابق؟ سو اس بارے میں واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے نظام کائنات کو اس نہج پر پیدا کیا ہے کہ اس کا ہر تغیر اور اس کا ہر واقعہ اسباب و علل کے ساتھ وابستہ اور مربوط ہے انسانی تجربہ اور انسانی تحقیق نے جو اسباب و علل دریافت کئے ہیں وہ اسباب عادیہ کہلاتے ہیں۔ اور جن اسباب و علل کی خبر اللہ کی وحی نے دی اور قرآن و سنت نے بتلایا وہ اسباب شرعیہ کہلاتے ہیں۔ اسباب عادیہ اور اسباب شرعیہ کی تاثیر بھی اللہ نے عطا فرمائی اور ان اسباب و علل کو اختیار کرنے کا حکم بھی اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ پس زکام میں گاؤزبان و بنفشہ پینا بخار میں کونین کی گولی استعمال کرنا، ڈاکٹر اور طبیب سے علاج کرانا یہ بھی دراصل اللہ ہی سے استعانت ہے۔ کیونکہ حق تعالےٰ ہی ان تدابیر کو اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں اور وہی ان میں اثرات ڈالتے ہیں۔ علیٰ ہذا قرآنی آیتوں کے وہ خواص اور ان کی وہ تاثیریں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی ہیں ان کو اختیار کرنا بھی بالکل ایسا ہی ہے جیسے بھوک کے رفع کرنے کے لئے کھانے سے اور پیاس بجھانے کے لئے پانی سے یا بخار کو دور کرنے کے لئے دوا گولی سے مدد لی جائے۔

حاصل یہ کہ غیر اللہ سے استعانت میں جب اعتماد اور بھروسہ مؤثر حقیقی یعنی اللہ پر ہوگا تو وہ استعانت درحقیقت اللہ ہی سے ہے غیر اللہ سے نہیں اور جب اعتماد و بھروسہ غیر اللہ پر ہو جائے تو وہ استعانت اسلام میں ناجائز اور ممنوع ہے پس "ایاک نعبد و ایاک نستعین" میں ۶ صفی گذارنده

کا فدویانہ تعارف یہ ہے کہ ہم سرِ نیاز تیرے ہی قدموں میں ڈالے ہوئے ہیں۔ جس کا نام بندگی اور عبادت ہے۔ اور یہ عبادت بھی تیری ہی توفیق اور مدد کی مرہونِ منت ہے یہ نیاز بالائے نیاز ہی ہمارا حقیقی تعارف ہے۔

سورۂ فاتحہ کے سابقہ مضمون کے ساتھ درمیانی اس آیت اور فدویانہ تعارف کا ربط و تعلق انتہائی لطیف اور معجزانہ ہے۔ یعنی پوری سورت کے مضامین کی نوعیت کو اگر غور کیا جائے تو تین طرح کے مضمون بن جاتے ہیں۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" سے "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" تک کا مضمون خالص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق ہے۔ اور "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم" سے آخر سورۃ تک کا مضمون بندہ سے متعلق، اس کا اپنا مقصد اور مدعا ہے اور درمیانی یہ آیت "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن" ابتدائی اور آخری مضمون کے لئے ایک حدِ مشترک ہے جس کا تعلق فی الجملہ ابتدائی مضمون حمد و ثنا سے بھی ہے اور آخر کے مضمون بندہ کے اصل مقصد اور مدعا سے بھی ہے۔ اور بلاغتِ کلام اور عرضِ مدعا کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب کسی عظیم المرتبت ہستی کے حضور اپنی مقصد براری کے لئے کوئی عرضی اور درخواست پیش کرنی ہو تو عرضی اور درخواست کا آغاز ایسے مضمون سے کیا جائے جو اس عظیم الشان ہستی کے لئے محبوب و پسندیدہ ہو۔ اور عرضی گذار کی طرف اس کی توجہات کو جذب کرے۔ اور اس حمد و ستائش کے بعد اور اصل مقصد بیان کرنے سے پہلے درمیان میں کچھ مضمون

ایسا آجائے کہ ممدوح کی توجہ کو خوش اسلوبی سے اصل مقصد کی طرف متوجہ کردے۔ کیونکہ حمد و ثنا کے بعد یک لخت اصل مدعا کو بیان کر دینا ممدوح کی خاطر گرانی کا سبب بن سکتا ہے اور درمیانی مضمون کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ وہ شروع اور آخر کے دونوں مضمونوں سے مناسبت رکھتا ہو۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ بتلا دیجئے ہم کو سیدھا راستہ

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ یہ سورہ درحقیقت بارگاہِ خداوندی میں بندہ کی طرف سے فدویانہ عرضی اور درخواست ہے، جو پانچ ضروری اور اہم ابواب پر مشتمل ہے (۱) شاہی القاب (۲) بندہ کا فدویانہ تعارف (۳) حرف مدعا، (۴) حامیوں کے ساتھ وابستگی اور (۵) مخالفین سے بیزاری۔

شاہانہ القاب اور فدویانہ تعارف کے دونوں ابتدائی ابواب پورے ہو چکے۔ یہاں سے تیسرے باب "حرف مدعا" کا آغاز ہے۔

حرف مدعا سے عرضی اور درخواست کا وہ مقصد مراد ہے جس کے لئے عرضی تیار کی گئی اور جس کو قبولیت و منظوری سے قریب تر بنانے کے لئے اول و آخر کے مضامین اور ابواب بڑھائے گئے یعنی صراط مستقیم کی ہدایت۔

چنانچہ بندہ اور فدوی اپنے پروردگار اور ہادی حقیقی سے دل کی مراد ان الفاظ میں مانگتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم یہ دعائیہ اور سائلانہ جملہ اس پوری سورۃ کا موضوع اور خلاصہ بھی ہے اور تمام سورۃ میں سب سے زیادہ

افضل و برگزیدہ جملہ بھی کیونکہ حدیث میں آتا ہے۔

لَيْسَ شَيْئٌ أَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ

کہ حق تعالیٰ کی نگاہ میں بندہ کی دعا سے زیادہ محترم کوئی چیز نہیں ہے

نیز اس لئے بھی کہ مراد اور دعا بندہ کی ہے اور اس کو ظاہر کرنے والے الفاظ دعا حق تعالیٰ کے ہیں۔ اس لئے قرآن و حدیث کی ماثورہ دعائیں انسانوں کی وضع کی ہوئی دعاؤں کے مقابلہ میں افضل اور مقبولیت سے زیادہ قریب ہیں، کیونکہ ماثورہ دعاؤں کے الفاظ کو کلام الٰہی اور کلامِ نبویؐ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شانِ ربوبیت کا کمال دیکھئے کہ حاجت اور ضرورت بھی اللہ نے پیدا کی۔ اس کے مانگنے کا داعیہ بھی اسی نے ہمارے دلوں میں القا کیا، اور مانگنے کے الفاظ بھی خود ہی تلقین کئے، اور سکھائے ؎

ہم بدلہائے نماید خویش را
ہم بدوزد خرقۂ درویش را

"اِهْدِنَا" دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ ایک "اِهْدِ" جو ہدایت سے امر کا صیغہ ہے، دوسرے "نَا" جو جمع متکلم کی ضمیر ہے۔

ہدایت۔ قرآن کریم کے کثیر الاستعمال اور اہم الفاظ میں سے ایک ہے۔

صاحب المفردات امام راغب اصفہانیؒ نے لکھا ہے کہ ہدایت کے لغوی معنی ہیں "دَلَالَةٌ بِلُطْفٍ" یعنی از راہِ خیر خواہی راہ دکھانا، عربی میں "ہوادی الوحش" ان وحشی جانوروں کو کہتے ہیں کہ جو بطور "مقدمۃ الجیش" آگے آگے چلنے

ہیں۔ دلالت اور رہنمائی خود اپنی جگہ عنایت و مہربانی اور خیر خواہی ہے۔ پھر بھی " بلطف " یعنی مہربانی کے ساتھ والا جزو ملانا ضروری ہے گویا کہ ہدایت دو بھلائیوں کا مجموعہ ہو ایک خود رہنمائی اور منزل مقصود کی نشان دہی کرنا، جو اپنی جگہ بڑی نیکی اور بڑی خیر خواہی ہے۔ دوسری رہنمائی اور نشاندہی میں بھی انداز اور طریقہ مشفقانہ اور محبت آمیز ہونا چاہیئے۔ اس لئے نہ تو غلط راہ پر ڈالنا ہدایت کہلائے گا اور نہ غیر مشفقانہ طریقہ سے صحیح راہ دکھانا ہدایت کا مصداق ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر لفظ ہدایت کا استعمال محمود اور اچھے مواقع میں ہوتا ہے ناپسندیدہ اور برائی کے موقع پر اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ الا یہ کہ تہکم اور استہزار کے طور پر استعمال کیا گیا ہو جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

" فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ — پس بتاؤ ان کو جہنم کی راہ۔

رہنمائی و رہبری کے طریقے دو ہیں ایک منزل مقصود کا اتا پتا بتانا، اور اس کی نشاندہی کرنا۔ دوسرا طریقہ راہگیر مسافر کو منزل تک پہنچا دینا۔

اسی لئے ہدایت کے مفہوم اور اس کے مصداق بھی دو ہیں۔ دلالتہ اور ایصال یعنی راہ دکھانا اور منزل پر پہنچانا مقام اور قرینے سے کسی ایک معنی کی تعیین کی جاتی ہے بعض علمار نے لکھا ہے کہ ہدایت کا لفظ جب لام اور الی کے ساتھ مستعمل ہو تو اس کا مفہوم راہ دکھانا ہو گا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ — یقیناً یہ قرآن وہ راہ بتاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے

یا دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَاهْدِنَا اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ۔ — اور بتا دے ہم کو سیدھی راہ۔

اور جب ان دو حروف کے بغیر مستعمل ہو تو اس کا مفہوم منزل مقصود تک پہنچانا ہوگا۔ لیکن یہ اصول اور ضابطہ بھی کلی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے صحیح یہ ہے کہ قرائن اور مواقع سے ہی اس کے مفہوم کا صحیح تعین کیا جا سکتا ہے۔ ہدایت کی ایک دوسری تقسیم یہ بھی ہے کہ راہنمائی اور راہ بتانے کے طریقے اللہ کی طرف سے لاتعد و لاتحصیٰ اور بے شمار ہیں۔ البتہ موٹی موٹی قسمیں یہ ہیں۔

الہامی ہدایت۔ یعنی کوئی چیز بطور القا کے دل میں ڈال دی جائے یا اس کی فطرت میں داخل کر دی جائے۔ جیسے نومولود بچہ کو دودھ پینے کا طریقہ بتانا۔ تکلیف اور درد کا اظہار کرنا اور درختوں کا زمین سے پانی چوس چوس کر بڑھنا۔ پھل پھول لانا اور شاخوں کا فضا میں پھیلنا وغیرہ۔

کائنات کی کوئی چیز اس القا اور الہامی ہدایت سے خالی نہیں ہے۔ اس الہامی ہدایت عامہ کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے۔

اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى — ہر شے کو پیدا کر کے مناسب طریقہ پر اس کی رہنمائی کی۔

ہدایت کی دوسری قسم احساسی ہدایت ہے جسمیں ظاہری و باطنی حواس کے ذریعہ گرم و سرد، مفید و مضر چیزوں کی خبر دینا ہے اور اسی احساسی ہدایت کی بدولت انسان و حیوان دونوں کی زندگیاں محفوظ ہیں۔

ہدایت کی تیسری قسم عقلی ہدایت ہے جو کہ انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور جس میں جوہر عقل کے ذریعہ انسان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ خواہ قلبی نور ہدایت کے ساتھ اور خواہ ترتیب مقدمات اور استدلال کے ساتھ۔

ہدایت کی چوتھی قسم الہام انبیاء کرام ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے یعنی عالم شہادت ہو یا عالم غیب جس مقام اور جس منزل پر بھی عقل انسانی عاجز و درماندہ ہے وہاں اللہ کی وحی رہنمائی کرتی ہے اور اس کے لئے انبیاء کرام بھیجے جاتے ہیں اور آسمانی صحیفے نازل کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اسی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا ۔ ہم نے انبیاء کرام کو پیشوا بنایا کہ وہ ہمارے حکم کی رہنمائی کرتے ہیں

پس ہدایت کی آخری قسم یعنی وحی اور الہام انبیاء ہی درحقیقت اصل ہدایت ہے جو ارسال رسل اور انزال کتب کا مقصود اوّلین ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں عقل اور وحی کا فرق بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ قلب انسانی کے دو دروازے ہیں۔ ایک عالم ملکوت اور ملاء اعلیٰ کی طرف سے اور دوسرا عالم شہادت کی طرف۔ عالم شہادت کے علوم حواس

ظاہرہ کے دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور علوم الٰہیہ والہامیہ ملاء اعلیٰ کے دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔

حرفِ مدّعا اور اصل درخواست جو ایک بندہ اور فدوی کی طرف سے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کی جارہی ہے اس کا عنوان ہے "اھدنا الصراط المستقیم" اس جملہ میں تین لفظ خاص طور پر قابل توجہ اور قابل تحقیق ہیں۔ ایک ہدایت دوسرے "الصِّرَاطَ" اور تیسرے "اَلْمُسْتَقِیْمَ" گذشتہ سطور میں ہدایت کی لغوی اور معنوی تحقیق اور اس کی قسمیں بیان کی جاچکی ہیں اب دوسرے لفظ الصراط کی تحقیق پیش ہے۔

"الصراط" کے متعلق ایک ضعیف سی رائے یہ بھی ہے کہ یہ لفظ عربی نہیں ہے بلکہ رومی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی طریق اور راستہ کے ہیں۔

مگر صحیح یہ ہے کہ لفظ "الصراط" عربی کا لفظ ہے اور اسکی اصل صورت السراط سین کے ساتھ ہے۔ اور قرأت کی بعض روایات میں اصل صورت ہی مروی ہے لیکن لغتِ قریش جو سب سے زیادہ فصیح ہے اس میں اس کا تلفظ صاد کے ساتھ ہے۔ گویا اصل السراط ہے اور اس کا زیادہ فصیح تلفظ الصراط ہے۔ عربی میں سرط کے معنی ہیں کسی چیز کو نگلنا۔ جس طرح کھانے کا لقمہ حلق سے نگلا جاتا ہے۔

سراط وہ راستہ ہے جو بڑے قافلوں کو نگل جاتا ہے یا قافلے اس راستہ کو طے کر کے گویا کہ نگل جاتے ہیں۔ یعنی وہ شاہراہ جس پر ہزاروں قافلے چلے اور گذر گئے مگر راستہ اپنی جگہ موجود ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جس میں پانچ خصوصیات پائی جائیں، وسیع اور کشادہ ہو مستقیم یعنی سیدھا ہو۔ سب سے زیادہ نزدیک اور قریب ہو۔ منزل مقصود پر پہنچانے والا ہو۔ اور منزل مقصود کے لئے اس واحد راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔

پس جس راہ میں یہ پانچوں صفتیں موجود ہوں وہ اَلصِّرَاطُ ہے اور جس میں یہ خصوصیات نہ ہوں وہ راہ "الصراط" کی مصداق نہیں ہے۔

"المستقیم" یہ صراط کی صفت ہے اور لفظی اعتبار سے اس کا ماخذ اور اس کی اصل استقامت ہے، اہل لغت نے لکھا ہے کہ استقامت کے لغوی معنی توسط اور اعتدال کے ہیں۔ جو افراط و تفریط کے ٹھیک درمیانی درجے کا نام ہے، درمیانی ہونے کی مناسبت سے استقامت کے معنی سیدھے ہونے کے بھی آتے ہیں۔ کیونکہ ماہرین اقلیدس نے لکھا ہے کہ دو نقطے قائم کر کے جب متعدد اور مختلف خطوط ملائے جائیں تو تمام خطوط میں بیچ کا خط سب سے زیادہ سیدھا اور قریبی ہو گا۔ اسی لئے مستقیم کے معنی سیدھے کے بھی کئے جاتے ہیں۔ نیز خط مستقیم ناقابل تغیر ہوتا ہے اور غیر مستقیم میں ہر وقت تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ خط مستقیم دائمی ہے اور غیر مستقیم عارضی۔ اسی مناسبت سے استقامت ایک ایسے اعلیٰ اخلاقی جوہر اور روحانی مقام کا نام بھی ہے جہاں عابد کو عبادت و طاعت میں رسوخ اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے اور خدا و رسول کی محبت سویدائے قلب میں ٹھہر جاتی ہے۔ تزلزل اور قدم ڈگمگانے کا اندیشہ اور خطرہ باقی نہیں رہتا

اسی لئے اکابرین معرفت کا ارشاد ہے۔
"اَلْاِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ" (جوہر استقامت اور مقام استقامت کرامت سے برتر ہے)

بہرحال "مستقیم" کے معنی ہیں سیدھا۔ رہی یہ بات کہ الصراط المستقیم" سے کیا مراد ہے؟ تو حضرت فضیل بن عیاس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد طریق الحج ہے لیکن علماء نے لکھا ہے کہ مخصوص معنی مراد لینے سے عام معنی مراد لینا بہتر ہے اور احادیث صحیحہ سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے اللہ کا وہ دین مراد ہے جس کے سوا اور کوئی دین اللہ کے یہاں قبول نہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے اسلام کا وہ راستہ مراد ہے جو ما بین السماء والارض سے بدرجہا زائد وسیع ہے۔

دین اسلام اور دین حق ہی وہ پانچوں خصوصیات بھی موجود ہیں جو حافظ ابن قیم نے الصراط کے لئے لازمی اور ضروری قرار دی ہیں۔

چنانچہ اسلام ایک ایسی وسیع شاہراہ ہے۔ جس پر اگر پوری نسل انسانی چلے تو سر مو تنگی نہیں پیدا ہو سکتی اور جس دور اور جس زمانے میں بھی اس راہ پر چلا جائے کسی قسم کی دشواری اس میں محسوس نہ ہو گی۔ قرآن کریم میں دین اسلام کی اسی قسم کی تنگی

کی نفی اور تردید ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ	تمپر دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔

یہاں یہ فرق بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئیے کہ تنگی اور دشواری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تنگی یہ ہے کہ راستہ ہی اپنی جگہ چلنے اور گذرنے کے قابل نہ ہو۔ دوسری تنگی یہ ہے کہ راستہ آسان اور سہل ہے۔ مگر خارجی اثرات اور گرد و پیش نے چلنا مشکل بنا دیا ہو۔ سو شاہراہِ اسلام ایک وسیع اور آسان رہ گذر ہے۔ جہاں راہ گیر کے لئے قدم قدم پر سہولت کا سامان موجود ہے مگر چلنے والے کے قدم اگر نہ اٹھیں تو اس میں راستہ کا کیا قصور ہے ؎

اللہ کی راہ اب بھی ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں۔
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پر چلنا چھوڑ دیا۔

جہاں تک شاہراہِ اسلام کے سیدھے اور مستقیم ہونے کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام افراط و تفریط کے بیچ میں اعتدال کا نام ہے جس میں نہ سختی ہے نہ ضرورت سے زیادہ نرمی۔ بلکہ فطرۃ کے عین مطابق ہے جس کا اظہار قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ	اللہ کی پیدا کردہ اس فطرۃ پر مضبوطی سے قائم رہو۔ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی بنائی ہوئی فطرۃ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ یہی ہے سیدھا دین

صراط کی تیسری خصوصیت ہے نزدیک اور قریبی ہونا سو اقلیدس کے اصول کے مطابق اوپر لکھا جا چکا ہے کہ خط مستقیم قدرتی طور پر تمام خطوط سے چھوٹا ہوتا ہے۔ لہذا اسلام کی سیدھی راہ منزل مقصود کے لئے سب سے زیادہ مختصر اور چھوٹی راہ ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ راستہ منزل مقصود پر پہنچانے والا ہو۔ سو انسان کا منتہائے مقصود اور زندگی کی غایت رضائے الٰہی ہے اور دین اسلام اس منزلِ مقصود کی واحد راہ ہے۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ منزلِ مقصود کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں تصریح ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

بلاشبہ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ، وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دین کا طالب ہوگا۔ تو وہ اس کی جانب سے ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

حرفِ مدعا اور فدویانہ درخواست کا ماحصل یہ نکلا کہ بندہ اللہ سے صراط مستقیم کی ہدایت مانگ رہا ہے اور صراط مستقیم ایک ہونے کے باوجود چلنے والے کی رفتار اور کیفیت کی بنا پر ہدایت و استقامت کے بہت سے درجات ہیں اور بندہ جس منزل پر ہوتا ہے اس سے اعلیٰ منزل کا خواہش مند ہوتا ہے اور ہدایت

واستقامت کا کوئی درجہ ایسا نہیں ہے جس کے اوپر اور اس سے افضل اور درجہ نہ ہو۔

اے برادر بے نہایت درگہیست | انچہ بر وے میرسی بر وے مایست

خاصان خدا کے ساتھ اظہار دوستی۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ | راستہ ان لوگوں کا جن پر آپنے انعام کیا ہے۔

شاہی القاب۔ فدویانہ تعارف اور حرف مدعا کے بعد بندگان اطاعت شعار اور خاصان خدا کے ساتھ اپنی دوستی اور محبت کا اظہار کیا جارہا ہے جس کو قبولیت درخواست اور عرض کی منظوری میں بڑا دخل ہے۔ نفسیات کا ایک مشہور اور مانا ہوا اصول ہے کہ دوست کا دوست بھی دوست ہوتا ہے اور دوست کا دشمن بھی دشمن ہوتا ہے۔ عربی کے مشہور شاعر متنبی نے بھی لکھا ہے

حبیب الی قلبی حبیب حبیبی

گویا محبوب کی ہر چیز پسندیدہ اور محبوب ہوتی ہے قیس عامری یعنی مجنوں کو لیلے سے عشق تھا۔ لیکن لیلی کے ساتھ ساتھ سگ لیلی اور دیار لیلی سے بھی والہانہ محبت تھی۔ فارسی کی مشہور کہاوت ہے

مراعات صد کن برائے یکے

قیس عامری کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے پورے قافلہ کے ساتھ سفر کر رہا تھا کہ راستہ میں ایک اجڑی ہوئی بستی کے کھنڈر نظر آئے۔ قیس عامری (مجنوں) فوراً اونٹ سے اتر گیا اور قافلے کو چھوڑ دیا بستی کے آثار اور کھنڈروں کو سلام کیا اور ان سے بغل گیر ہو کر انھیں خوب چوما اور پیار کیا۔ اہل قافلہ نے دیوانگی کی ان حرکتوں کو دیکھ کر اس کو پاگل اور فاتر العقل قرار دیا

قیس عامری نے جواب دیا کہ تمہارے دل کسی لیلیٰ کی محبت سے نا آشنا ہیں اسی لئے تمہیں آداب محبت کی خبر نہیں ہے ؎

اے فاختہ پرواز کناں بر سر ہرے
حالِ دلِ مرغان گرفتار چہ دانی

قیس عامری نے حقیقت نا آشنا دوستوں کو مخاطب کرکے دو شعر پڑھے ؎

مَرَرْتُ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى
أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَذَا الْجِدَارَا
وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِي
وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

یعنی میں اس اجڑی ہوئی بستی کے پاس سے گذرا جسمیں کبھی لیلےٰ رہا کرتی تھی تو میں آدابِ محبت بجا لایا۔ اوران کھنڈروں کو سینے سے لگایا اور بوسہ دیا مگر یہ محبت اور شغف اینٹ پتھر سے یا در و دیوار سے نہیں ہے بلکہ اس لیلیٰ کی محبت کی وجہ سے ہے جو کبھی اس بستی اور بستی کے ان مکانوں میں رہتی تھی، حضرات صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ کو جو محبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی وہ مجنوں کی محبت سے بھی بدرجہا فائق اور اعلیٰ تھی۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے تمام عمر مدینہ طیبہ میں جوتا نہیں پہنا کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ جب میں جوتا پہنتا ہوں تو مجھے یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں میرا جوتا زمین کے ان ذرات پر نہ پڑ جائے جن پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک رکھا گیا ہو، گویا قدم مبارک کے چھونے سے وہ ذرات اس درجہ محترم اور مقدس ہوگئے

کہ ان پر اپنا جوتا رکھنا خلاف تعظیم اور سوء ادب ہے۔ معلوم ہوا کہ محبت کا قدرتی خاصہ یہ ہے کہ محبوب کی ہر چیز محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی بنا پر حضرات اہل بیت اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے محبت بالکل فطری اور لازمی ہے اور یہی حال ناپسندیدگی ناخوشگواری اور عداوت کا ہے محبوب کا مخالف اور دشمن عاشق کی نظروں میں دشمن ہوتا ہے حضرت کعب ابن مالک رضی اور دوسرے دو صحابہ رضی غزوۂ تبوک میں اپنی سستی اور امروز و فردا کے ارادہ کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ناراضگی اور برہمی کا اظہار فرمایا اور ان تینوں صحابہ رضی کے ساتھ بائیکاٹ کا اعلان فرما دیا حدیث میں آتا ہے کہ۔

کعب بن مالک رضی کی بیوی نے بھی گھر رہنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ ہوں گے میں بھی تمہارے گھر رہنے میں راضی نہ ہوں گی۔

پس اس محکم اور مانے ہوئے اصول کی بنا پر ایک عرض گذار اور فدوی اپنی عرض میں اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کے ساتھ اپنی وابستگی اور اپنے تعلق کا اظہار کرتا ہے

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ — یعنی خاصان خدا اور مقبولان بارگاہ ایزدی کی راہ مطلوب ہے جن پر تیرے انعام اور تیرے فضل کی بارش ہوئی۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ صراط الذین انعمت علیہم میں صراط مستقیم کی نشانی بتلائی گئی ہے۔ تاکہ صراطِ مستقیم کی تعین

ہو سکے اور اس کا مصداق معلوم ہو جائے ۔ کیونکہ محض انسانی عقل سے صراط مستقیم کا پتہ چلانا مشکل بلکہ ناممکن ہی عقل انسانی ہادی نہیں ہے بلکہ محتاج ہدایت ہے نور ایمان سے منور ہو جاتی ہے اور ظلمتِ کفر سے تاریک ۔ یہی وجہ ہے کہ کافر کی عقل بھی کافر ہوتی ہے اور مؤمن کی عقل بھی مؤمن ہوتی ہے ، کافر کی عقل سے مرتب کئے ہوئے دلائل کفر و انکار کا نتیجہ پیدا کرتے ہیں اور مؤمن کی عقل سے مرتب کئے ہوئے دلائل ایمان کی منزل پر پہنچاتے ہیں ، عقل کا خود کوئی نصب العین اور مذہب نہیں ہے ۔ عقل عقل والوں کے جذبات و احساسات کی تابع ہے ۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے اسے بہروپیہ قرار دیا ہے

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارا نہ ملّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

بہر حال صراط مستقیم کی تعیین میں چونکہ عقل حیران تھی اور کسی نتیجے پر نہیں پہونچ سکتی تھی اس لئے حق تعالے نے وحی کے ذریعہ صراط مستقیم کی علامت اور نشانی بتلا کر اس کے صحیح مصداق کو متعین کر دیا کہ صراط مستقیم درحقیقت منعم علیہم کا راستہ ہے ۔

رہی یہ بات کہ منعم علیہم کون ہیں سو اس کے لئے انعام اور نعمت کے معنی سمجھنا ضروری ہیں ۔ عربی لغت میں نعمت کے معنی ہیں نرمی ۔ ثوب ناعم اور جلد ناعم کے معنی ہوتے ہیں نرم کپڑا اور نرم کھال ، پھر ظاہری و جسمانی نرمی کے علاوہ باطنی و روحانی نرمی یعنی لذت و سرور اور عیش و عشرت کی کیفیت کو اور سامان عیش کو بھی نعمت کہنے لگے کیونکہ کیفیت

وسرور یا سامان عیش طبع انسانی کو نرم اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور پریشانی وغم کو بوجھ اور گرانی سمجھا جاتا ہے۔ انعام کے معنی ہیں کسی کو اس طرح نعمت دینا کہ انعام سے محض احسان مقصود ہو اور اپنی کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ اسی لئے منعم حقیقی سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ انعام واحسان سے اس کی اپنی کوئی غرض نہیں ہے۔ بلکہ صرف بندوں کو نوازنا ہے

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

حق تعالیٰ کی نعمتیں اس قدر گوں ناگوں اور بے شمار ہیں کہ خود قرآن کریم نے خبر دی ہے

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔	اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو کبھی شمار نہ کر سکو گے۔

کچھ دنیاوی ہیں اور کچھ اخروی۔ کچھ وہبی ہیں اور کچھ اکتسابی۔ کچھ جسمانی اور کچھ روحانی وغیرہ۔ یہاں وہ اخروی نعمتیں مراد ہیں جن کا نتیجہ اور فائدہ آخرت میں ظاہر ہوگا جیسے ایمان، عمل صالح۔ توفیق الٰہی۔ وغیرہ کیونکہ دنیاوی وجسمانی نعمتیں عام ہیں۔ مومن اور کافر دونوں کے لئے حتیٰ کہ اللہ کے باغی بھی دنیاوی نعمتوں سے محروم نہیں ہیں۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب
گبر وترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

یہ روحانی اور آخروی نعمتیں جن کو عطا کی گئی ہیں وہ ہی

منعم علیہم ہیں اور انھیں کی راہ صراط مستقیم ہے۔
صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کے متعلق بعض محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" میں راہ کی درخواست تھی اور "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ" میں رفیق سفر اور راہنما کی درخواست ہے۔ کیونکہ کوئی راہ بالخصوص ہدایت کی راہ کسی رہنما اور رفیق کے بغیر طے نہیں کی جاسکتی۔ اسی لئے مشہور ہے "الرفیق ثم الطریق"، یعنی رفیق پہلے اور سفر بعد میں۔ راستہ کے بہت سے نشیب و فراز ایسے ہوتے ہیں جہاں تنہا تلقین کافی نہیں ہوتی بلکہ کسی رہنما اور قائد کی ضرورت ہوتی ہے اور وہی رفیق سفر ہے جس کو صوفیا کی اصطلاح میں مرشد اور شیخ کہا جاتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے رفیق سفر کی اہمیت کے بارے میں فرمایا ہے

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق
عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

یعنی منزل عشق یا راہِ عشق کے لئے رفیق ہونا ضروری ہے ورنہ بلا رفیق کے عمر ضائع ہوگی اور منزل مقصود نہ مل سکے گی

اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام ظاہر و باطن کی اصلاح اور درستگی کا نام ہے۔ ظاہر سے مراد شریعت کے وہ اعمال و احکام ہیں جن کا تعلق ہاتھ پاؤں اور ظاہری اعضاء جسم سے ہے جیسے نماز روزہ، زکوٰۃ و حج وغیرہ اور باطن سے مراد شریعت کے وہ اعمال و اخلاق ہیں جن کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں بلکہ باطن جسم یعنی نفس اور قلب سے ہے حق تعالےٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔

وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ — اور تم ظاہری و باطنی دونوں گناہ چھوڑ دو

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ طاعت و معصیت دونوں چیزیں ظاہر و باطن سے متعلق ہیں اور محض ظاہر کی اصلاح اسلام کی نظر میں اصلاح نہیں ہے۔ جب تک کہ باطن بھی پورے طور پر مزکی اور درست نہ ہو جائے۔ ظاہر کی اصلاح کے لئے ایک حد تک کتاب کافی ہے مگر باطن کی اصلاح کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مخفی کیفیات اور پوشیدہ احساسات سے سابقہ پڑتا ہے اور جس طرح بیمار اپنی کیفیتِ مرض کا اندازہ لگانے اور علاج کرنے میں قاصر ہے اسی طرح ہر انسان اپنی کیفیت اور جذبات کا خود تجزیہ نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر نخوت و غرور اور تکبر اخلاقی اعتبار سے بدترین عیب ہے بلکہ تمام بداخلاقیوں کی جڑ ہے حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلَۃٍ مِّنْ کِبْرٍ

وہ شخص ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہوگا۔

اسی طرح عزتِ نفس اور خودداری نہایت شریفانہ جوہر اور حسن اخلاق کی جڑ ہے جس سے انسان کے درجے بلند ہوتے ہیں دین توحید نے غیر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے اور اس کو حاجت روا بنانے کو اسی لئے حرام اور شرک قرار دیا ہے کہ یہ انسانی کرامت اور شرف کے خلاف ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
جب جھکا تو غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

تفصیل بالا سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کبر اخلاقی جرم اور باطن کا گناہ ہے اور خودداری اخلاقی جوہر اور باطن کی عبادت ہے مگر

مشکل یہ ہے کہ دونوں کی صورت اور کیفیت تقریبًا ایک سی ہے
کبر میں بھی سر اونچا رہتا ہے اور خودداری میں بھی،
تواضع اور پستی دونوں متضاد ہیں۔ مگر شکل دونوں کی ایک
جیسی ہے۔

ایک انسان بالخصوص مبتلائے مرض اپنے بارے میں کبھی
فیصلہ نہیں کرسکتا کہ آیا اس میں کبر ہے یا خودداری، تواضع ہے
یا پستی۔ اس لئے روحانی ایکسرے کی ضرورت ہے اور وہ صاحب
نظر مرشد عارف کی نگاہ ہے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نہ تواں گشت بہ تصدیق خرے چند

یہاں روحانی طبیب اور زندہ معالج کی ضرورت ہے جو
مرض کی تشخیص کرکے اصلاح کا نسخہ تجویز کرے اور مریض اس کی
ہدایت پر اپنے باطن کی اصلاح کرے۔ تصوف کی اصطلاح میں
روحانی معالج کو شیخ اور پیر کہتے ہیں اور مریض کو سالک اور مرید
کہتے ہیں، رائج الوقت کاروباری پیری مریدی نے صوفیہ کی ان
اصلاحی و تربیتی کوششوں کو کافی حد تک بدنام کیا ہے ؎

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

باطن کی اصلاح کے لئے کسی مصلح اور مربی کی ضرورت بالکل
ناگزیر اور ضروری ہے اگر ڈاکٹر و حکیم کے بھیس میں شعبدہ بازی
و ٹھگی ہونے لگے تو علاج و معالجہ کو غیر ضروری اور متروک نہیں
قرار دیا جاسکتا، البتہ صحیح طبیب اور معالج کی تلاش میں پوری
احتیاط کرنی چاہئے تاکہ دھوکہ اور خداع سے بچ سکیں۔ امام
غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں صحیح قسم کے شیخ کی نشانیاں

اور علامتیں بتلائی ہیں جن کا پڑھنا ضروری ہے، پھر اس روحانی رفیق اور شیخ کا کام صرف راہ دکھانا اور منزل کا پتہ بتلانا ہے نہ اس کے ہاتھ میں اپنی اور اپنے مریدوں کی نجات ہے اور نہ یہ اپنے مریدوں کو بخشوانے کا ضامن اور کفیل ہو سکتا ہے۔

راہ بر تو بس بتا دیتا ہے راہ
راہ چلنا راہرو کا کام ہے
تجھ کو رہبر لے چلے گا دوش پر
یہ تیرا رہرو خیال خام ہے

بہرحال صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں خواہ سیدھی راہ کی تعیین ہو اور خواہ رفیقِ سفر کی درخواست ہو منعم علیہم سے مراد اللہ کے برگزیدہ اور مقبول بندے ہیں۔ جن کا شیوہ بندگی اور اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ قرآن پاک میں منعم علیہم کی وضاحت اور تفصیل دوسری جگہ اس طرح فرمائی ہے۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا	جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کریں گے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ جن کو اللہ نے اپنے انعاموں سے نوازا ہے یعنی انبیاء صدیقین۔ شہداء اور صالحین اور یہ حضرات بہترین رفیق ہیں۔

معلوم ہوا کہ راہ مستقیم دراصل وہ ہے جس پر انبیاء کرام اور صدیقین و شہداء اور صالحین چلے ہیں۔ اور یہی چار طبقے اطاعت گذار بندوں کے بہترین رفیق ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ

عام مسلمانوں کو صالحین کی رفاقت اور صالحین کو شہدا کی رفاقت اور شہدا کو صدیقین کی رفاقت اور صدیقین کو انبیاء کرام کی رفاقت طلب کرنی چاہیئے۔ کیونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ درجہ بدرجہ ہی ترقی کر سکتا ہے اگر درمیانی درجات کو چھوڑ کر اوپر کا درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو ناکام بھی رہے گا اور اس درجہ کے لئے نااہل بھی ثابت ہوگا پس عام مومنین جب صالحین اور اہلِ تقویٰ کی معیت و رفاقت اختیار کریں گے تو ان میں وہ کیفیت پیدا ہوگی اور درجہ شہادت اور کیفیات شہداء کو حاصل کرنے کے اہل ہو سکیں گے اور اس کے بعد جب شہداء کی رفاقت و معیت میں رہیں گے تو اس درجہ کی کیفیت ایمان و یقین سے سرفراز ہو کر صدیقیت کے درجۂ ایمانی اور اس کی کیفیت کے حصول کے لئے قلب و ذہن میں اہلیت و صلاحیت پیدا ہو جائے گی، اور مرتبہ صدیقیت کی کیفیت اذعان و ایمان کے حصول کے بعد کمالات نبوت کا ادراک و شعور میسر آ سکے گا۔ یہاں ایک بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ مرتبہ صدیقیت تک کے روحانی کمالات اور ایمانی کیفیات کا فی الجملہ کسب سے تعلق ہے اس لئے ممکن ہے کہ انسان جد و جہد کر کے اس مرتبہ تک پہنچ جائے لیکن درجۂ نبوت اور اس درجہ کی اہلیت و کیفیات اکتسابی نہیں ہوتیں بلکہ محض وہبی ہوتی ہیں، اس لئے مرتبہ نبوت پر کوئی شخص کسی سلوک و مجاہدہ سے نہیں پہنچ سکتا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کسی کسی خوش نصیب کو اس معراج انسانیت کے کمالات کا ادراک اور شعور ہو سکتا ہے۔ خاصانِ خدا کے ساتھ اظہار دوستی۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر میں مفسرین کی دونوں آیتیں

اور دونوں توجیہیں سامنے آچکی ہیں "صراط مستقیم" کی تعیین اور اس کی علامت کی توجیہ بھی اور سیدھی راہ کے "رفقا" اور ساتھیوں والی توجیہہ بھی اب اس کی وضاحت ضروری ہے کہ "منعم علیہم" کے مصداق کون ہیں اور منعم علیہم سے کون لوگ مراد ہیں۔ ممکن ہے بعضوں کی نظر میں "منعم علیہم" کا مفہوم اور اس کی مراد عام ہو کہ جن پر بھی اللہ کا فضل وکرم اور اللہ کا انعام ہو وہ "منعم علیہم" ہیں۔ مگر قرآن کریم کے بعض الفاظ مصطلحات قرآن میں سے ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے اور اس کی تفسیر و وضاحت یا خود قرآن کریم میں ملے گی یا ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ جیسے "ایمان، صلوٰۃ، صوم وغیرہ کے الفاظ کہ یہ اسلام اور قرآن کریم کے اصطلاحی الفاظ ہیں اور ان کی تشریح خود قرآن و حدیث سے ملے گی۔ لغت کا اس میں دخل نہیں ہے اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں کہا گیا ہے "یفسر بعضہ بعضاً" کہ قرآن کریم کی بعض آیتیں بعض آیتوں کی تشریح اور تفسیر ہوتی ہیں۔ پس "منعم علیہم" بھی قرآن کریم کی مخصوص اصطلاح ہے۔ اور اس کی تشریح قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے جو پانچویں پارہ کی سورۂ نساء میں ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔	جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کریں گے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن کو اللہ نے اپنے انعاموں سے نوازا ہے۔ یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین۔ اور یہ حضرات بہترین رفیق ہیں۔

گویا قرآن کریم کی نظر میں "منعم علیہم" چار اطاعت شعار جماعتوں کا اور گروہوں کا نام ہے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین جن کی معیت اور رفاقت جنت میں ان لوگوں کو نصیب ہو گی جو اللہ اور اس کے رسول کے فرماں بردار اور اطاعت شعار ہونگے

بعض مفسرین نے اس آیت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر بے صبری اور بیقراری کا عشق تھا کہ ایک روز حضورؐ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوئے کہ چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور جسم نہایت نحیف اور لاغر ہو گیا تھا، غم عشق چھپانے کے باوجود نہ چھپا سکے ؎

ملتواں داشت نہاں عشق زمردم لیکن
زردیٔ رنگ رخ و خشکی لب راچہ علاج

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاج پرسی فرمائی اور دریافت کیا کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں کوئی تکلیف ہے؟ حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ میری بیماری اور تکلیف اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا میں میری بے صبری اور بے قراری کا یہ حال ہے کہ جب تک میں آپ کو دیکھ نہ لوں میری طبیعت میں شدید قسم کی وحشت اور دیوانگی پیدا ہو جاتی ہے تو مجھے یہ فکر ہے کہ آخرۃ میں اگر جنت میں داخلہ نصیب بھی ہو گیا تب بھی آپ درجات انبیاء میں ہوں گے۔ اور میں معمولی بندوں اور امتیوں کے مقام میں ہوں گا۔ تو میں کس طرح آپ کو دیکھ سکونگا اور اگر مجھے جنت ہی نہ ملی پھر تو ابد تک دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس یہ فکر اور یہ غم مجھے گھن کی طرح کھا رہا ہے اسپر

قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں معیت و رفاقت کی خوش خبری دی گئی ہے کہ اگرچہ درجات مختلف ہوں گے مگر رفاقت و ملاقات ضرور ہو گی۔

بعض مفسرین نے شان نزول کے سلسلہ میں بعض دوسرے واقعات بھی نقل فرمائے ہیں۔ لیکن ان جزوی واقعات کے باوجود قرآن کریم کی یہ آیت اپنے مقصد کے اعتبار سے عام ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت پر آمادہ کرنا اور ابھارنا مقصود ہے گویا جو شخص بھی اللہ و رسول کی زیادہ سے زیادہ اطاعت و فرمانبرداری کرے گا وہ آخرت کے اور جنت کے مراتب عالیہ کا مستحق ہو گا۔

غرضیکہ قرآن کریم کی اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ کی نظر میں یہی مذکورہ بالا چار گروہ "منعم علیہم" ہیں۔ جن کی اہلیت و صلاحیت کے مطابق ہر ایک پر انعامات خداوندی ہوتے ہیں،

حضرت شاہ عبد العزیز محدث و مفسر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جملہ کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے محققانہ انداز میں بہت لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ راہ ہدایت کی اصل اور اس کا سرچشمہ عالم غیب ہے جس کا حقیقی علم بجز ذات خداوند علام الغیوب کے کسی کو حاصل نہیں۔ چنانچہ عالم غیب سے وحی کے ذریعہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ تعلیم فرماتے ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام سے یہ فیض براہ راست صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، صدیقین سے شہداء کرام کو اور شہداء کرام سے صلحاء" کو راہ ہدایت کا فیض حاصل ہوتا ہے اس نکتہ کی وضاحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان چاروں القاب کا شرعی مفہوم سمجھ لیا جائے لہذا نبی کی تعریف اور اس کا مفہوم

شرعی پہلے جان لینا چاہیئے، کیونکہ عالم غیب سے فیوض کے حاصل ہونے کا مبداء اور سب سے پہلا واسطہ نبی ہی ہوتا ہے جس کے توسط کے بغیر کوئی باطنی کمال کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا شریعت کی اصطلاح میں نبی مخصوص ترین باطنی صلاحیتوں کے انسان کو کہا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں دو قسم کی قوتیں ہوتی ہیں۔ ایک قوت علمیہ و نظریہ اور دوسری قوت عملیہ۔ قوت عقلیہ و علمیہ کے ذریعہ انسان تمام چیزوں کو جان سکتا ہے اور قوت عملیہ کے ذریعہ کسی کام کو کر سکتا ہے۔ پس نبی وہ انسان ہے جس کی دونوں باطنی قوتوں کی تربیت بغیر کسی بشری واسطہ کے حق تعالیٰ براہِ راست خود ہی فرماتے ہیں اور اس تربیت ربّانی ہی سے اس کی نظری و عملی قوتیں نقطۂ کمال تک پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ نبی کی قوت علمی پر بلا واسطہ فیض ربانی کی نورانی شعاعیں اس طرح اثرانداز ہوتی ہیں کہ اس کے علم میں جتنی معلومات آتی ہیں انہیں کبھی اشتباہ واقع نہیں ہوتا۔ ہر چیز اس کے علم میں ممتاز اور واضح ہوتی ہے اسی طرح نبی کی قوت عملیہ کمال قوت علمی کے اثر سے اس درجہ کامل ہو جاتی ہے کہ ہر عمل صالح بلا تکلف بلکہ انتہائی قلبی رغبت کے ساتھ کر سکے اور ہر عمل بد سے اس کی طبیعت اور اس کا دل غایت درجہ نفرت کرے اسی لئے ہر نبی معاصی اور گناہوں سے لازمی طور پر معصوم ہوتا ہے اور اور جس انسان کی یہ دونوں قوتیں حد کمال کو پہنچی ہوئی ہوں یقیناً اس کی تجربات اور حالات و واقعات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بھی اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی ہوگی، غرض جس انسان کی یہ دونوں قوتیں فیض ربانی کی براہ راست تاثیر سے کامل ہو جاتی ہیں اسکو حق تعالیٰ مخلوق کی ہدایت اور تکمیل و تربیت باطنی کے لئے رسول

بنا کر مبعوث فرماتے ہیں اور اپنے عقلی و اخلاقی اور عملی و کرداری امتیاز و برتری کے ذریعہ اگرچہ ہر نبی اپنی قوم میں بلکہ دوسرے تمام انسانوں میں ممتاز اور فوق تر ہوتا ہے جو اس کے اعلان نبوت کی صداقت و سچائی کی کھلی علامت ہو سکے لیکن اس کے باوجود ہر نبی کو قدرت کے ایسے کرشمے اور معجزے حق تعالیٰ کی جانب سے نبوت کی سند اور تصدیقی سرٹیفکٹ کے طور پر عطا فرمائے جاتے ہیں جن کا کوئی دوسرا شخص مقابلہ نہ کر سکے اور جو نبی کے قول کی صداقت و حقانیت کی واضح علامت بن سکیں۔

باغیوں سے بیزاری:۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ	جن پر نہ غضب کیا گیا ہے اور نہ
لَا الضَّآلِّيْنَ ۝	وہ گمراہ ہیں۔

سورۂ فاتحہ جو اپنے مفہوم اور انداز بیان کے اعتبار سے بارگاہِ الوہیت میں بندہ کی مکمل مناجات اور حق تعالیٰ شانہ کی جناب میں فدویانہ عرضی اور درخواست ہے مضامین کی رو سے چند عنوانات اور ابواب پر مشتمل ہے اور اس کی تفصیل سطور بالا میں گذر چکی ہے ان میں سے شاہی القاب، بندہ کا فدویانہ تعارف، حرف مدعا اور حامیوں کے ساتھ دوستی و محبت کے ابواب حسب توفیق الٰہی پورے ہو چکے ہیں اب پانچواں اور آخری باب، باغیوں سے اظہار بیزاری سپرد قلم ہے۔ حرف مدعا میں صراط مستقیم اور سیدھی راہ کی ہدایت طلب کی گئی تھی اور اس پر چلنے والے اور نہ چلنے والے انسانوں کے دو گروہ قدرتی طور پر بن جاتے ہیں۔ کیونکہ سیدھی اور بیچ کی راہ سے افراط و تفریط کی دو راہیں منطقی طور پر ضروری ہیں اس لئے صراط مستقیم

کے بعد میں دو گروہوں کا ذکر کیا گیا۔ ایک سیدھی راہ پر چلنے والے "منعم علیہم" کا اور افراط و تفریط اختیار کرنے والے ناپسندیدہ و نامقبول گروہوں کا۔ جن کو مغضوب علیہم اور ضالین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے یعنی منعم علیہم گروہ کا ذکر اللہ کے اطاعت شعار اور فرمانبردار بندوں کے ساتھ اپنی وابستگی اور تعلق خاطر کے اظہار کیلئے ہے کہ

حبیب الی قلبی حبیب حبیبی۔

اور یہ کمال محبت اور انتہائی وفاداری ہے جس کو قبولیت درخواست میں بڑا دخل ہے۔ پھر "المغضوب علیہم" اور "الضالین" کے دونوں نامقبول و ناپسندیدہ اور باغیوں کے گروہ کا ذکر اس مقصد کیلئے ہے کہ اللہ کے باغی اور نافرمانوں سے اپنی بیزاری اور برأت کا اعلان ہو جائے۔ اور مخالفین سے بیزاری کے اظہار کو بھی عرضی کی قبولیت میں بڑا دخل ہے کیونکہ دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے۔ چنانچہ باغیوں کے انہی دو گروہوں کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

"غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" عربی میں نحوی ترکیب اور گرامر کی رو سے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین صفت ہے الذین انعمت علیہم کی اور غیر بمعنی مغائر اور مختلف جس کا حاصل یہ ہوگا کہ منعم علیہم وہ ہیں جو غضب الٰہی اور ضلال دونوں سے محفوظ ہیں بلکہ دونوں سے متضاد اور مغایر ہیں۔

حضرات مفسرین نے قرآن کریم کی بلاغت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے غیر المغضوب علیہم کو لفظ غیر کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور حرف "لا" کے ساتھ یعنی لا المغضوب علیہم نہیں فرمایا کیونکہ حرف لا صرف ماقبل کی نفی کیلئے آتا ہے گویا لا المغضوب علیہم کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا۔ نہ اہل

غضب کا۔ اور لفظ غیر ماقبل کی نفی کیلئے بھی آتا ہے اور مغایرت کیلئے بھی فرق یہ ہے کہ لفظ غیر میں مغائرۃ کی تصریح ہوتی ہے اور نفی ضمنی طور پر مقصود ہوتی ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا جن کا راستہ اہل غضب و اہل ضلال کے راستہ سے بالکل مختلف اور الگ ہے۔ یہ معنوی لطافت صرف لفظ غیر کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

المغضوب یہ لفظ غضب سے بنا ہے اور غضب انعام کی ضد اور اس کا مقابل ہے اسی لئے منعم علیہم کے متصل المغضوب علیھم کا ذکر کیا گیا۔ غضب کے لغوی معنی ہیں شدۃ اور سختی۔ اسی لئے الغضبۃ پہاڑ کی سخت اور مضبوط چٹان کو کہتے ہیں اور غضوب زہریلے سانپ اور شوخ اونٹنی کو بھی کہتے ہیں۔

غضب دراصل نفس کی اس ہیجانی کیفیت کا نام ہے جو انتقام کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے۔

اتقوا الغضب فانہ جمرۃ	غضب سے دور رہو کہ وہ انسان
توقد فی قلب ابن آدم	کے دل میں دھکتے ہوئے انگارہ
الم تروا الی انتفاخ	کی طرح ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا
اوداجہ وحمرۃ عینیہ	کہ غصہ والے آدمی کے گلے کی رگیں

کیسی پھول جاتی ہیں اور اس کی آنکھیں کیسی سرخ ہو جاتی ہیں۔

اسی لئے حدیث میں غصہ اور غضب کا علاج وضو تجویز کیا گیا ہے کہ اس کے پانی سے غصہ کی آگ بجھ جاتی ہے۔ پھر غضب الٰہی سے مراد جرم کی سزا دینا اور عذاب میں مبتلا کرنا ہے حق تعالیٰ کے ارشاد یعنی حدیث قدسی میں اسی طرف اشارہ ہے۔

سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ — میرے غضب پر میری رحمت غالب ہے

"المَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ" وہ قومیں اور وہ لوگ جن پر قہر خداوندی اور غضب الٰہی نازل ہوا۔ الضالین ضلال سے بنا ہے۔ اور ضلال کے اصلی معنی ہیں ایسی راہ چلنا جو منزل مقصود تک نہ پہنچائے۔ گویا کہ ضلال ہدایت کا مقابل اور اس کی ضد ہے اور جس طرح درجات ہدایت لاتعد ولا تحصی ہیں اسی طرح ضلالت کے درجے بھی بے شمار ہیں نیز ضلالت کے معنی کبھی کبھی ناواقف اور بے خبر ہونے کے بھی آتے ہیں۔ اسی معنی میں حق تعالٰی نے ضلال کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف فرمائی۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى — اللہ نے آپکو ناواقف پایا پھر اسنے واقف کردیا

بے راہ روی اور گمراہی عیب ہے جس سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پاک ہے اور ناواقفیت اور بے خبری کوئی عیب نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں صراحتہً فرمایا۔

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ — آپ نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس قرآن کو نور بنایا کہ اپنے بندوں میں سے جس کو ہم چاہتے ہیں اس سے ہدایت دیتے ہیں۔

بہرحال مغضوب علیہم کا مفہوم ہے مقہور اور ضالین کا مفہوم ہی گمراہ رہی یہ بات کہ "المغضوب علیھم" اور الضَّآلِّیْنَ کے مصداق کون ہیں سو عام طور پر مفسرین نے لکھا ہے کہ "المغضوب علیہم" سے یہود مراد ہیں اور الضالین سے نصارٰی۔ اور قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبویہ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

یہود کے بارے میں حق تعالٰی نے ارشاد فرمایا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔	اور ذلت اور دوسروں کی طرف محتاجی ان پر (ٹھپے کی طرح) مار دی گئی اور وہ لے کر لوٹے اللہ کا غضب

اس سے معلوم ہوا کہ یہود اللہ کی مغضوب قوم ہے اور المغضوب علیہم سے یہود ہی مراد ہیں اور قرآن کریم میں جہاں نصاریٰ کا ذکر ہے۔ وہ یہ الفاظ ہیں۔

وَضَلُّوْا عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ	اور بھٹک گئے وہ سیدھی راہ سے

اس آیتہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نظر میں ضال اور گمراہ نصاریٰ ہیں نیز عدی بن حاتمؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھا تھا۔ کہ مغضوب علیہم اور ضالین سے مراد خداوندی کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ مغضوب علیہم سے یہود اور ضالین سے نصاریٰ مراد ہیں۔ پس ایک عرضی گذار فدوی اپنی درخواست میں اعلان کرتا ہے کہ میں یہود۔ نصاریٰ جیسے دشمنان اسلام سے بیزار ہوں کیونکہ وہ اللہ کے رسول کے اور دین اسلام کے دشمن ہیں۔

محققین علماء نے لکھا ہے کہ مغضوب علیہم اور ضالین کے مفہوم کو یہود و نصاریٰ تک محدود کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں لفظوں کا مفہوم اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ منعم علیہم سے وہ کامل ترین افراد مراد ہیں جن کی معرفت حق اور علم بھی صحیح ہے اور عمل وکردار بھی درست اس کے برخلاف اگر کسی میں معرفت خداوندی اور علم تو صحیح ہے مگر عمل موجود نہیں ہے تو وہ المغضوب کا مصداق ہے۔ کیونکہ جان بوجھ کر اور دیدہ و دانستہ خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اللہ کا غضب اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اور اگر عمل موجود ہے مگر علم صحیح نہیں ہے تو وہ ضالین میں

شمار ہوگا۔ گویا واقف وبے عمل مغضوب کا مصداق ہے خواہ کافر ہو۔ یا
فاسق مسلمان اور بلا معرفت عامل ضالین کا مصداق ہے۔ خواہ کافر
ہو یا گمراہ مسلمان۔ پس مفہوم دونوں کا عام ہے ؎

جو عدو باغ ہو برباد ہو　　　کوئی گل چیں ہو یا صیاد ہو

تامین:۔

سورہ فاتحہ کی تشریح اور تفسیر کے سلسلہ میں وہ پانچوں ابواب
اور عنوانات مکمل ہو گئے۔ جو مناجات اور فدویانہ عرضی کے ضروری اجزاء
تھے۔ سورۂ فاتحہ کے اختتام پر یعنی "ولا الضالین" کے بعد "آمین" کا
لفظ پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تحقیق اور اس کی شرعی حیثیت
معلوم ہونا بھی لازمی اور ضروری ہے

عربی زبان میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جن کا دنیا کی دوسری
زبانوں میں وجود نہیں۔ مثال کے طور پر عربی میں بعض مفرد الفاظ اور
مصادر ایسے ہیں جن کے معانی مفرد نہیں ہیں بلکہ پورے جملہ یا عبارت
کے مفہوم کا پتہ دیتے ہیں جیسے بسملہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا
یا حوقلہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھنا وغیرہ۔ عربی کے اسی
قسم کے الفاظ میں سے "تأمین" بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں آمین کہنا جس
طرح تحمید کے معنی الحمد للہ کہنا۔ اور تہلیل کے معنی ہیں لا الہ الا اللہ
کہنا۔ تکبیر کے معنی ہیں اللہ اکبر کہنا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا
ارشاد ہے۔

اذا امن الامام فامنوا　　　جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو

گویا "تأمین" کے معنی ہیں زبان سے لفظ آمین کہنا
خود لفظ آمین کے بارے میں اہل لغت نے لکھا ہے کہ عربی میں یہ
ایسا لفظ ہے جو خود اسم ہے مگر اس کے معنی فعل کے ہیں۔ حضرت

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہیں نے براہِ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "آمین" کے معنی کیا ہیں جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ "آمین" کے معنی ہیں "رب افعل" یعنی اے پروردگار میرے تو کردے" امام ترمذی فرماتے ہیں کہ آمین کے معنی ہیں "لاتخیب رجاءنا۔ یعنی اے اللہ! ہماری امید کو ناکام نہ بنایئے۔

گویا عبد سائل اپنی جھولی پھیلائے اور دست سوال دراز کئے ہوئے بارگاہِ ربوبیت میں اپنی صدا لگا رہا ہے، عرضی پیش کر رہا ہے اور آخر میں بڑی لجاجت سے اور گڑگڑا کر کہتا ہے آمین۔

یعنی یہ عرضی بڑی امیدوں سے پیش کی گئی ہے اور امید کرم کے سوا دوسرا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ اور ناکام واپس کرنا تیری شان کریمی کے خلاف ہے کسی شاعر نے انتقال سے پہلے یہ شعر لکھ کر تکیہ کے نیچے رکھ دیا تھا ؎

مَالِی اِلَیْکَ وَسِیْلَۃٌ اِلَّا الرَّجَا
وَجَمِیْلُ فَضْلِکَ ثُمَّ اَنِّیْ مُسْلِم

یعنی کوئی نیکی اور عمل خیر میرے پاس نہیں ہے بجز اس کے کہ میں مسلمان ہوں اور امید کرم لے کر آیا ہوں۔ بعض علماء نے لکھا ہے آمین کے معنی ہیں استجب لنا۔ یا تقبل منا۔ کہ ہماری درخواست اور ہماری دعا کو قبول فرما۔ کچھ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ آمین اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

آمین میں دو تلفظ یا دو لغتیں منقول ہیں آمین مد کے ساتھ یاسین کے وزن پر اور امین قصر کے ساتھ یمین کے وزن پر۔ مگر

مشہور لغت آمین مد کے ساتھ ہے۔ لفظ آمین کے بارے میں جملہ مفسرین اور تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ لفظ نہ جزو قرآن ہے اور نہ جزو فاتحہ۔ اسی لئے قرآن میں اور سورۂ فاتحہ میں آمین لکھی نہیں جاتی بلکہ جس طرح تمام دعاؤں کے بعد آمین کہنا مسنون ہے، اور اجابت دعا کے لئے گویا ضروری اسی طرح سورہ فاتحہ کے بعد بھی مسنون ہے۔ کیونکہ سورۂ فاتحہ بھی درحقیقت مناجات اور دعا ہے اور قرآن و غیر قرآن میں فرق اور امتیاز باقی رکھنے کے لئے تلاوت اور کتابت میں یہ اصول رکھا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ سے فراغت کے بعد " ولا الضالین " پر سانس توڑ کر کسی قدر وقفہ کے ساتھ آمین کہنا چاہئے۔ اور ملا کر آمین پڑھنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ قرآن و غیر قرآن میں خلط اور التباس پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ختم فاتحہ پر آمین پڑھنا ضروری ہے۔ مگر آمین کتابت میں نہیں لکھی جاتی تاکہ قرآن و غیر قرآن میں خلط ملط نہ ہونے پائے۔

حدیث کی اہم اور معتبر کتابوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو نقل کیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اذا امن الامام فامنوا فانہ	جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو
من وافق تامینہ تامین	اس لئے کہ جس کا آمین کہنا فرشتوں
الملائکۃ غفر لہ ما تقدم	کے آمین کہنے کے موافق ہو جائیگا
من ذنبہ	اسکے گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے

اس حدیث میں مغفرت ذنوب یعنی خطاؤں کی معافی کا دار و مدار چار چیزوں پر رکھا گیا ہے۔ امام کا آمین کہنا۔ مقتدی کا آمین کہنا، ملائکہ کا آمین کہنا۔ اور آمین کہنے میں موافقت۔ اس سے معلوم ہوا

کہ امام و مقتدی دونوں کو آمین کہنا چاہئے۔ اور ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اجابت و قبولیت میں آمین کو بڑا دخل ہے۔

حضرت ابو زہیر نمیری ایک جلیل القدر صحابی ہیں ان کے بارے میں مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سے جب کوئی شخص دعا مانگے تو وہ دعا کو آمین پر ختم کرے۔ کیونکہ آمین کی حیثیت ایسی ہے جیسے کتاب کے آخر میں مہر ہوتی ہے۔ انہی صحابی سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک شب میں باہر نکلے۔ کہتے ہیں ہمارا گذر ایک ایسے شخص پر ہوا جو بڑی لجاجت سے اور گڑگڑا کر اللہ سے اپنی مراد مانگ رہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی دعا کو سن کر ٹھہر گئے اور آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے اپنی دعا کو صحیح طریقے پر ختم کیا تو اس نے سب کچھ پا لیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شخص نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ یہ شخص کس طرح ختم کرے، آپ نے فرمایا، کہ اس کو چاہئے کہ یہ اپنی دعا آمین پر ختم کرے۔

بعض احادیث میں مروی ہے "آمین" خاتم رب العالمین" یعنی آمین پروردگار عالم کی مہر ہے کہ جس طرح صحیفہ اور کتاب مہر لگا دینے کے بعد ہر قسم کے تصرف سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اس میں ردوبدل یا کمی بیشی کا امکان نہیں رہتا۔ اسی طرح آمین بھی بندہ کی مناجات پر اللہ کی سرکاری مہر ہے کہ اس کے بعد صاحب دعا ہر قسم کی بلا اور آفت سے محفوظ ہو جاتا ہے اور قبولیت دعا کی ضمانت ہو جاتی ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آمین جنت کے درجات میں سے کسی درجہ کا نام ہے۔ آمین کے بارے میں حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں لکھا ہے کہ آفرینش عالم سے امت محمدیہ علی صاحبہا

الصلوٰۃ والتحیۃ تک بجز حضور کی امت کے کسی نے آمین کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آمین کا لفظ استعمال کیا ہے گویا صرف ان دو پیغمبروں کو چھوڑ کر اقوام عالم میں یہ لفظ ملت محمدیہ کی خصوصیت ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان اللہ اعطیٰ امتی ثلاثاً لم یعط احداً قبلھم السلام وھو تحیۃ اھل الجنۃ و صفوف الملائکۃ و امین الا ما کان من موسیٰ و ھارون	بیشک اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں میری امت کو ایسی عطا فرمائی ہیں جو اس سے پہلے کسی کو عطا نہیں فرمائیں۔ ایک سلام یعنی امت محمدیہ کے باہم سلام کرنے کے الفاظ کہ یہ الفاظ اہل جنت کا سلام ہیں

دوسرے فرشتوں کی صفیں اور تیسرے "آمین"۔ بجز اسکے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے جو آمین کہا لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرعون کے خلاف بددعا کی اور حضرت ہارون نے آمین کہی گویا ربنا حضرت موسیٰ نے کہا اور آمین حضرت ہارون نے۔ یہ دعا اور آمین دونوں میں مشترک ہو گئی، اسی لئے قرآن کریم میں اس دعا کے بارے میں فرمایا۔

قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا	تم دونوں کی دعا یقینی طور پر قبول کر لی گئی۔

حدیث بالا سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ "السلام علیکم کا جملہ دراصل اہل جنت کی باہمی ملاقات کا "تحیۃ" ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کیلئے دنیا میں ملاقات کا تحیہ قرار دیدیا گیا اور قطار در قطار کھڑا ہونا یہ خصوصیت ملائکہ کی تھی جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عبادت نماز کے لئے عطا فرما دی کہ ملائکہ کی طرح تم بھی صفیں باندھو

نیز یہ کہ آمین بھی دنیا کی ملّتوں میں ملّت محمدیہ ؐ کی خصوصیت ہے۔ رہی یہ بات کہ آمین آہستہ پڑھی جائے یا زور سے سو ائمہ احناف کے یہاں آہستہ پڑھنا مسنون ہے۔ اور بعض دوسرے ائمہ کے یہاں جہر بہتر ہے۔ مگر یہ اختلاف اتنا ہلکا اور معمولی اختلاف ہے کہ اس پر مسلمانوں میں جھگڑے اور فساد کی نوبت آنا انتہائی شرمناک اور قابلِ افسوس ہے ؎

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ ملّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

ختم شد

(باہتمام مستقیض احمد صدیقی انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپا)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

درس قرآن

یعنی تفسیر

استعاذہ، بسم اللہ و سورۃ الفاتحہ

اثر خامہ

خطیب العلماء مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ

ناشر

مکتبہ غزالی

متصل مسجد فرقانیہ جیکب لائن کراچی ۳

ہدیہ رف کاغذ دو روپے - سفید گلیز تین روپے